# یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟

مولانا سید جلال الدین عمری

# فہرست عنوانات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پیش لفظ

ہمارا ملک جن سنگین مسائل سے دوچار ہے ان میں یہاں کے فسادات کا مسئلہ سب سے نمایاں مقام حاصل کر چکا ہے۔ یہ فسادات ہماری ملکی اور قومی زندگی کا ایک طرح سے معمول بن گئے ہیں اور ان کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہیں آ رہا ہے۔ جب کوئی فساد ہوتا ہے تو اس کے اسباب تلاش کے جاتے ہیں، کچھ دن بحث و مباحثہ جاری رہتا ہے، ایک دوسرے پر الزامات عائد کیے جاتے ہیں، کسی کسی گوشہ سے افسوس اور صدمہ کا اظہار ہوتا ہے، تھوڑا بہت ریلیف کا کام بھی ہوتا ہے اور پھر زندگی کی گاڑی نئے خطرات، اندیشوں اور بدگمانیوں کے ساتھ چلنے لگتی ہے۔ ہر فساد کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ سوال سوچنے سمجھنے والے ذہن کو پریشان کیے رہتا ہے کہ یہ فسادات بار بار کیوں ہوتے ہیں، ان کا سلسلہ کیوں نہیں ٹوٹتا، کیوں یہاں کا امن وسکون تھوڑے تھوڑے وقفہ سے غارت ہوتا رہتا ہے، کیا اس ملک کے مختلف طبقات یہاں امن وسکون اور صلح و آشتی کے ساتھ نہیں رہ سکتے، انھیں ایک دوسرے سے کیا شکایات ہیں، ان کے درمیان کون دوری پیدا کر رہا ہے اور نفرت اور تعصب کی فضا کیوں پروان چڑھ رہی ہے، کیوں یہ احساس نہیں ابھر رہا ہے کہ یہ فسادات کسی فرقہ کے لیے نہیں، بلکہ پورے ملک کے لیے تباہ کن ہیں؟

یہ اور اس نوعیت کے بعض اور سوالات سے پیش نظر مضامین میں بحث کی گئی ہے۔ ان میں شروع کے پانچ مضامین میں اہل ملک سے عمومی خطاب ہے، بعد کے مضامین میں خاص مسلمانوں سے گفتگو کی گئی ہے، لیکن سب ہی مضامین اسلامی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ صرف دو ایک مضامین کا نہیں بلکہ سب ہی مضامین کا مطالعہ کیا جائے۔ ان میں مسلمانوں کے لیے تذکیر ہے اور انھیں ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ برادرانِ وطن سے میری گزارش ہے کہ وہ اس نقطۂ نظر سے توحش اور تکدر نہ محسوس کریں، بلکہ ٹھنڈے دل و دماغ سے اسے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کریں۔ یہ گزارش ایک بہی خواہ اور ہم درد کی ہے۔ اسے اپنا حریف اور مخالف نہ تصور کیا جائے۔

یہ مضامین مختلف اوقات میں مختلف مناسبتوں سے پانچ سال کے عرصہ میں لکھے گئے ہیں اور ماہ نامہ ''زندگی نو'' اور سہ ماہی ''تحقیقاتِ اسلامی'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب نظر ثانی اور حذف و اضافہ کے بعد کتابی شکل میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں دو ایک مقامات پر تکرار سی محسوس ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مضمون اپنی جگہ مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لیے اسے برداشت کرنا پڑا ہے۔ مضمون کے آخر میں اس کی تاریخ اشاعت دے دی گئی ہے۔ اس سے اس کے پس منظر کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ایک مضمون کے عنوان ہی کو کتاب کا عنوان بنا دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس مقصد سے یہ مضامین لکھے گئے ہیں وہ پورا ہو اور اس کے بندوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔

جلال الدین عمری

۷/ مارچ ۱۹۹۳ء

# طبعِ جدید

جس وقت یہ مضامین لکھے گئے تھے اس کے بعد ملک کے سیاسی حالات میں تو نشیب وفراز آتا رہا ہے، لیکن جن بنیادی مسائل سے ان میں بحث کی گئی ہے ان میں کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ کبھی کبھی سیاسی افق پر صبح صادق کے آثار نظر آتے ہیں، لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے جس بصیرت اور ہوش مندی کی ضرورت ہے اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ان مضامین میں ملکی حالات اور مسائل کا جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے، خدا کا شکر ہے اسے پسند کیا گیا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ بعض مضامین پمفلٹس کی شکل میں بڑے پیمانہ پر اردو اور ہندی میں تقسیم بھی ہوئے۔ مضامین کے اس مجموعہ کے دو ایڈیشن اس سے پہلے نکل چکے ہیں۔ اب کی بار کسی قدر نظر ثانی کے بعد زیادہ بہتر انداز میں اس کی اشاعت عمل میں آرہی ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ 'ہمارا دیش کدھر جا رہا ہے؟' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس کے تین ایڈیشن سامنے آچکے ہیں۔ اسی نوعیت کا میرا ایک اور مجموعہ مضامین 'ملک وملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمے داریاں' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔ جو لوگ ان مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہیں ان کے لیے یہ دونوں ہی مجموعے ان شاء اللہ مفید ثابت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر صراطِ مستقیم واضح فرمائے اور اپنی نصرت وحمایت سے نوازے۔

جلال الدین عمری

۱۷ر فروری ۲۰۰۶ء

# فرقہ وارانہ ہم آہنگی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟

یہ اپریل ۱۹۸۸ء کی بات ہے کہ اتر پردیش کے بعض مقامات کا اس مقصد سے دورہ کرنے کا اتفاق ہوا کہ ملک میں خیر سگالی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ماحول پیدا کیا جائے۔ اس دورہ میں کہیں کہیں میرے خطاب کا نظم تھا۔ زیادہ تر سمپوزیمس (Symposiums) رکھے گئے تھے، جن میں مجھے اختتامی یا صدارتی تقریر میں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔

ان سمپوزیمس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ مقامی طور پر نمایاں جن مسلم یا غیر مسلم حضرات کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی، وہ سب کے سب یا ان میں سے بیشتر شریک ہوئے، اس مہم سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا، بہت سے لوگوں نے اسے اپنی دل کی آواز کہا، سب نے اس دکھ کا اظہار کیا کہ آزادی کے اکتالیس (۴۱) سال بعد بھی ملک فرقہ وارانہ فسادات سے نجات نہیں پا سکا ہے۔ ان پروگراموں میں مسلم اور غیر مسلم دانشوروں نے اس 'ناسور' کے مختلف علاج تجویز کیے۔ یہاں ہم غیر مسلم دانشوروں کے خیالات اپنے تاثرات کے ساتھ پیش کریں گے۔ ان میں سے بعض باتیں مسلم دانشوروں نے بھی کہیں اور ان سے ہٹ کر کچھ اور پہلوؤں کی طرف بھی توجہ دلائی۔ اس کا ذکر اللہ نے چاہا تو کسی دوسرے موقع پر ہوگا۔

غیر مسلم حضرات کی طرف سے ایک بات بہت وضاحت کے ساتھ سامنے آئی اور بیش تر مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ جھگڑے

بالعموم مذہب کے نام پر ہوتے ہیں۔ حالاں کہ کوئی بھی مذہب تعصب، نفرت، عداوت، دشمنی اور ظلم و زیادتی کی تعلیم نہیں دیتا، وہ ہر ایک سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ کسی بے گناہ کو قتل کرنا، لوٹ مار مچانا، عفت و عصمت پر دست درازی کرنا ہر مذہب میں گناہ اور پاپ کے کام ہیں۔ کسی مذہب نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ماحول کو بگاڑنے، فسادات کے بھڑکانے، آگ اور خون کی ہولی کھیلنے، درندگی، بربریت اور سفاکی کے مظاہرے کی کسی مذہب نے تعلیم نہیں دی ہے۔ اخوت و محبت، ہم دردی و غم خواری اور تہذیب و شرافت ہر مذہب کے لازمی عناصر ہیں۔ ان کے بغیر مذہب کا تصور نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس ملک کی بدنصیبی یہ ہے کہ مذہب کا نام لینے کے باوجود اس کی ان پاکیزہ تعلیمات کا آپس کے تعلقات میں کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔

مذہب کے ساتھ مذہب کے علم برداروں کا رویہ بھی زیر بحث آیا اور اس پر تنقید کی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے علم بردار اگر حق پرست ہوں، ان کا ذہن تعصب اور نفرت سے پاک ہو، وہ فراخ دل اور وسیع الظرف ہوں تو اس کا اثر عام افراد پر پڑسکتا ہے اور ان کے ذہن وفکر کی اصلاح ہوسکتی ہے، لیکن یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ مذہب کے علم بردار ہی اس کی ان تعلیمات سے دور ہیں بلکہ تعصب اور نفرت کے پیدا کرنے میں ان کا حصہ کسی سے کم نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مذہب کو چند بے جان مراسم کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اسے اس حیثیت سے نہیں پیش کیا جاتا کہ وہ انسان کے اندر اعلیٰ اخلاق پیدا کرتا ہے، دشمن کے ساتھ بھی محبت کرنا سکھاتا ہے اور ایک دوسرے کا احترام کرنے اور تعلقات کو حیوانوں کی سطح تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ مذہب جن اخلاقیات کی تعلیم دیتا ہے وہ اگر ہم میں پیدا ہوجائیں تو فکر و عمل کے بہت سے اختلافات کے باوجود ہم ایک دوسرے کو برداشت کرسکتے ہیں۔

مذہب کے علم برداروں کی ایک کم زوری یہ بھی ہے کہ انھوں نے یہ دنیا ظالموں اور سرکشوں کے حوالہ کر رکھی ہے۔ وہ ظلم و زیادتی اور ہنگامہ و فساد کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانے اور اس کا مقابلہ کرنے کی ان میں ہمت نہیں ہوتی، بلکہ اس کا جذبہ بھی ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ انھیں یہ خوف طاری رہتا ہے کہ نفرت اور تعصب کی آگ خود ان کو بھسم کر کے نہ رکھ دے۔ مذہب کے علم برداروں کی اس بزدلی اور بے ہمتی سے فساد پھیلانے والوں کے حوصلے بلند ہوتے ہیں اور وہ اپنے مذموم مقاصد پورے کرنے میں زیادہ آسانی سے کامیاب ہوجاتے ہیں۔ مذہب کے ماننے والوں کا فرض ہے کہ وہ پورے عزم اور ہمت کے ساتھ غلط کاروں اور فتنہ پردازوں کا مقابلہ کریں۔ جب تک وہ اس کے لیے تیار نہ ہوں گے فتنہ و فساد کی آندھیاں چلتی رہیں گی اور ملک کو اس کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔

یہ کوشش شخصی اور انفرادی حیثیت میں نہیں، بلکہ مل جل کر اور متحد ہوکر کی جانی چاہیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ مذہب کے نام لیوا ہیں اور جو تعصب اور نفرت اور فتنہ و فساد کو ناپسند کرتے ہیں وہ متحد اور متفق نہیں ہیں، جب کہ شر پسندوں اور فساد کرنے والوں کی کوششیں مربوط اور منظّم ہوتی ہیں۔ وہ ایک منصوبہ کے تحت فساد کرتے اور کراتے ہیں۔ منظّم اور منصوبہ بند کوششوں کا جواب منتشر مساعی نہیں بن سکتیں۔ اس کے لیے جدوجہد بھی منظّم کرنی ہوگی۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ ہمارے سیاست داں اور ملک کے راہ نما مذہب کو اپنی گندی سیاست کے لیے استعمال کرتے ہیں اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کو لڑا کر سیاسی فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

یہ اعتراض دراصل اپنی کم زوری اور سادہ لوحی کا اعتراف ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ مفاد پرست لیڈر اور جماعتیں ہر دور میں اور ہر جگہ اپنے ناپاک اغراض کے لیے

افراد کو بھی استعمال کرتے رہے ہیں اور نظریات کو بھی۔ ان کی اس استحصالی روش پر کسی کو حیرت اور تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ آدمی ان غلط کاروں پر مستقل لعن طعن کرتا اور انھیں برا بھلا کہتا رہے اور پھر بار بار اور بڑی آسانی سے ان کا آلۂ کار بھی بن جائے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ تنقید بھی برائے تنقید ہے۔ اس کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا فیصلہ نہیں ہے۔ اگر اہل مذہب یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ کسی غلط شخص کے آلۂ کار نہیں بنیں گے، کسی کی ناپاک خواہشات اور مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جو مذہب کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے، ظلم و زیادتی اور فتنہ و فساد پر آمادہ کرنے والی طاقتوں کا جم کر مقابلہ کریں گے تو کوئی بھی شخص انھیں فسادات کی آگ میں زبردستی نہیں جھونک سکتا۔ کسی مذہب کے ماننے والے کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ مفسدوں، شرارت پسندوں اور غنڈوں کے ہاتھوں میں کھیلتا رہے اور اسے دنیا ایک ایسے مجرم کی حیثیت سے یاد رکھے جو مذہبی اقدار پر یقین رکھنے کے باوجود اس کی خلاف ورزی کرتا رہا۔

کہا جاتا ہے کہ فسادات حکومت کراتی ہے۔ یہ اس کی ایک سیاسی ضرورت بن گئے ہیں۔ انگریزوں نے یہاں لڑاؤ اور حکومت کرو (Divide and Rule) کی حکمت عملی اختیار کی تھی۔ چناں چہ اس نے بڑی ہوشیاری سے ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور عداوت کے بیج بوئے، اختلافات پیدا کیے اور اس بات کی مسلسل کوشش کی کہ یہ دونوں قومیں کسی مسئلہ پر متحد اور متفق نہ ہوں، اس لیے کہ ان کے اتحاد اور اتفاق میں اسے اپنے اقتدار کی موت نظر آتی تھی۔ چناں چہ اس کی ساری کوشش کے باوجود ملک کی آزادی کے لیے جب یہ دونوں قومیں متحد ہوگئیں تو اس کے اقتدار کا تختہ ڈگمگانے لگا اور بالآخر اسے ہندستان چھوڑنا پڑا۔ انگریز یہاں سے چلا گیا لیکن یہاں جو حکومت بھی اقتدار میں رہی اس نے 'Divide and Rule' کے نسخہ کو سینے سے لگائے رکھا

اور اسی کو استعمال کرتی رہی۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت نے اس سلسلہ میں انتظامیہ کے خلاف کبھی کوئی سخت کارروائی نہیں کی۔ حکومت اگر سخت رویہ اختیار کرے تو کہیں فساد نہیں ہوسکتا اور ہوجائے تو پھیل نہیں سکتا۔

یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے اور ایک لمبے عرصہ سے سننے میں آرہی ہے، لیکن حکومت اور برسر اقتدار پارٹی ہی نہیں ملک کی سیاسی پارٹیوں میں کوئی پارٹی ایسی نظر نہیں آتی جو فسادات میں ظالم کو برملا ظالم کہے اور کھل کر مظلوم کا ساتھ دے، جو گروہی، لسانی اور مذہبی تعصّبات سے پاک ہو، جو دل سے فسادات کو ختم کرنا چاہتی ہو اور اس کے لیے کوئی جامع پروگرام رکھتی ہو، اس لیے موجودہ حکم راں طبقہ کی جگہ کوئی دوسری پارٹی برسر اقتدار آجائے تو بھی صورتِ حال میں کسی تبدیلی کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار دونوں کا ذہن اس معاملہ میں صاف نہیں ہے۔

یہاں ایک سوال ذہن میں بار بار ابھرتا ہے۔ وہ یہ کہ کیا اس ملک کی قیادت ہمیشہ ان ہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈال کر حکومت کریں گے؟ جو فتنہ و فساد کو ہوا دیں گے اور جنھیں حق و انصاف سے زیادہ اپنا ذاتی مفاد عزیز ہوگا؟ یہ ملک ایسی قیادت اور راہ نمائی سے محروم ہی رہے گا جو عدل و انصاف کی علم بردار ہو، جو ہر حال میں حق و صداقت پر قائم رہے، جو اپنے آپ کو خطرات میں ڈال کر بھی حق کا ساتھ دے، جسے اپنی حکم رانی کو باقی رکھنے سے زیادہ اس بات کی فکر ہو کہ کسی کے حقوق نہ مارے جائیں، کسی کم زور پر زیادتی نہ ہو، کوئی مظلوم انصاف سے محروم نہ رہے اور کوئی بے گناہ کسی جرم میں پکڑا نہ جائے؟ افسوس کہ سیاسی پارٹیوں پر تنقید اور فرقہ وارانہ ہنگاموں کو ناپسند کرنے والوں میں بھی کوئی اس سطح کا فرد یا گروہ نظر نہیں آتا۔ اس سلسلہ کی چھوٹی بڑی کوئی کوشش ہوتی بھی ہے تو اس کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی، بلکہ اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ صاف ستھرے

مقاصد میں ناپاک عزائم ڈھونڈ لیے جاتے ہیں اور ملک کے خیر خواہوں پر ملک کی بدخواہی اور ملک دشمنی کا لیبل لگ جاتا ہے۔

بعض لوگ وحدتِ ادیان کے فلسفہ کو فرقہ وارانہ فسادات کو ختم کرنے اور مختلف فرقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک آدمی کا یہ تصور کہ وہی حق پر ہے اور دوسرا لازماً باطل پر ہے، تمام جھگڑوں کی بنیاد ہے۔ حالاں کہ مذاہب کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ سب کی منزل ایک ہے۔ ہر مذہب اسی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر یہ حقیقت ذہن میں بیٹھ جائے کہ مذہب کا اختلاف راستوں کا اختلاف ہے، منزل کا اختلاف نہیں ہے تو مذاہب کے تمام جھگڑے ختم ہوسکتے ہیں۔ بعض لوگ اس لئے کو اس حد تک آگے بڑھاتے ہیں کہ مذہب کی انفرادیت ختم ہوجائے۔ نہ کوئی ہندو ہندو رہے اور نہ کوئی مسلمان مسلمان۔ مذاہب کی مشترکہ تعلیمات باقی رکھی جائیں اور اختلافی امور ختم کردیے جائیں۔

مذاہب کے بارے میں یہ تجزیہ صحیح نہیں ہے۔ ان کے درمیان محض رسم و رواج اور چند ظاہری اعمال کا اختلاف نہیں ہے، بلکہ بالکل بنیادی نوعیت کے اختلافات ہیں۔ جن کا تعلق اساسی افکار و عقائد اور ان سے براہِ راست نکلنے والے اعمال سے ہے۔ اہل مذاہب سے یہ مطالبہ کہ وہ اپنے افکار و عقائد ہی سے دست بردار ہوجائیں غیر حقیقت پسندانہ ہے اور ان عقائد و افکار پر قائم رہتے ہوئے وحدتِ ادیان کا تصور عملی روپ نہیں اختیار کرسکتا۔

ایک علاج یہ بھی تجویز کیا جاتا ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان شادی بیاہ کو رواج دیا جائے، اس سے اجنبیت کا احساس کم ہوگا اور قربت و یگانگت پیدا ہوگی۔ اس سلسلہ میں بعض مسلمان بادشاہوں کی مثالیں بھی نمونہ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔

جہاں تک مسلمان بادشاہوں کا تعلق ہے ایک تو یہ کہ وہ اسلام کے حقیقی نمائندے نہیں تھے، دوسرے یہ کہ انھوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے تحت جو غلط

اقدامات کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔ ان کے اس عمل کی کوئی دینی اور مذہبی حیثیت نہیں ہے۔ یہاں یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ شادی سے مرد اور عورت کے درمیان زندگی بھر کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ اس میں استواری اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کہ ان میں فکری ہم آہنگی پائی جائے۔ فکری اختلاف کے ساتھ اس تعلق میں پائے داری کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ اس کا باقی رہنا بھی بہت مشکل ہے۔ میاں بیوی کے درمیان مذہب کا اختلاف بھی اس تعلق کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس طرح کے رشتے بالعموم انھیں جوڑوں کے درمیان کامیاب ہوتے ہیں، جنھیں مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ انھیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ ان کی شریکِ حیات ان کی ہم مذہب ہے یا اس کا کوئی دوسرا مذہب ہے، وہ منکرِ مذہب ہے یا مخالفِ مذہب۔ اس طرح کے بے دین افراد کا عمل اہلِ مذاہب کے لیے کوئی نمونہ نہیں ہے۔

شادی بیاہ کا تعلق مذہب سے براہِ راست جڑا ہوا ہے۔ کم از کم اسلام کے بارے میں یہ بات بالکل واضح ہے۔ وہ اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ اس کے ماننے والے اس کے منکرین اور مخالفین سے ازدواجی رشتہ قائم کریں۔ جو رشتے اس طرح قائم ہوں ان کے قانونی حقوق اور ذمہ داریاں بھی وہ تسلیم نہیں کرتا ـــــ اہلِ کتاب عورتوں سے اس نے بعض شرائط کے ساتھ نکاح کی گنجائش رکھی ہے۔ اس کی تفصیل سے یہاں بحث نہیں ہے ـــــ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ بنیادی عقائد میں وہ اسلام سے قریب ہیں۔ اس کے باوجود اپنی عورتیں اہلِ کتاب کے نکاح میں دینے کی اس نے اجازت نہیں دی۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے اور تعصب و نفرت کی خلیج کو پاٹنے کی ایک تدبیر یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مذہبی تقریبات میں شریک ہوں۔ اس سے ذہن وفکر کے فاصلے کم ہوں گے اور قرب بڑھے گا، کہا جاتا ہے کہ تقسیمِ ہند سے پہلے اس طرح کی فضا تھی جو اب کم ہوتی چلی گئی ہے۔

کسی بھی مذہب کی تقریبات کا سلسلہ اس کے بنیادی عقائد اور تصورات سے وابستہ ہوتا ہے۔ ہر مذہبی تقریب اپنا ایک فلسفہ رکھتی ہے اور یہ فلسفہ مذہب کے بنیادی فلسفہ کے تابع ہوتا ہے۔ اس فلسفہ کو ماننے کے بعد ہی ان تقریبات کا وجہِ جواز پیدا ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات وہ ضروری ہوجاتی ہیں۔ اس کے بغیر انسان ذہنی سکون محسوس نہیں کرتا۔ یہ تقریبات درحقیقت انسان کی عقیدت اور محبت کا اظہار ہیں۔ اس کے لیے ذہنی ہم آہنگی ضروری ہے۔ جس شخص کا ذہن کسی مذہب کے بنیادی فلسفہ سے ہم آہنگ نہیں ہے اور اسے وہ غلط اور باطل سمجھتا ہے وہ اس کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار نہیں کرسکتا۔ اگر کرتا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ نمائشی طور پر کرتا ہے۔ صاف بات ہے کہ نمائشی حرکتوں سے کوئی سنجیدہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ وہ لوگ بڑے سادہ لوح ہیں جو اس طرح کی سطحی تدبیروں سے دونوں قوموں کے مابین پائے جانے والے فاصلوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

بعض کمیونسٹ ذہن کے لوگوں کا یہ خیال بھی سامنے آیا کہ مذہب تمام جھگڑوں کی بنیاد ہے۔ اسے ختم ہونا چاہیے۔ جہاں کوئی مذہب ہی نہ ہو وہاں اس قسم کے جھگڑے ہی نہیں پیدا ہوں گے۔

جو لوگ یہ بات کہتے ہیں شاید وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں یا قصداً اس پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں مذہب نے فتنہ وفساد نہیں مچا رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ تو انسانوں کا خون بہایا جارہا ہے اور نہ ان کے حقوق کی پامالی ہورہی ہے۔ یہ سب دورِ جدید کے افکار کی لعنت ہے۔ مادیت، اخلاقی اور روحانی قدروں کا فقدان، قوم پرستی، وطن پرستی، نسل پرستی اور ایک طرف بدترین آمریت اور دوسری طرف بے قید جمہوریت نے خدا کی زمین کو فتنہ وفساد سے بھر رکھا ہے اور پوری دنیا امن، چین اور سکون کے لیے تڑپ رہی ہے۔ خوش نما دعووں کے باوجود ان نظریات نے امریکہ کے کالوں کو مساوات سے محروم کر رکھا ہے، ان ہی کی وجہ سے روس، چین اور کمیونسٹ

ممالک کو تاریخ کے بدترین جبر و تشدد کے تحت زندگی گزارنی پڑ رہی ہے، افریقہ کے سیاہ فام باشندوں کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے عام انسانی حقوق کا مطالبہ کریں، ان کو جو سزائیں دی جا رہی ہیں اس سے دورِ وحشت کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وقت کے ساتھ حالات میں فرق ضرور آیا ہے، لیکن نوع انسانی کی خیرخواہی کے لیے ذہن وفکر میں جس بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے وہ ابھی رونما نہیں ہوئی ہے۔ موجودہ دور کے افکار یا تو مذہب کے مخالف ہیں اور اسے جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں یا اسے انھوں نے زندگی کے ایک تنگ گوشہ میں ڈال رکھا ہے۔ پوری دنیا میں مذہب کو کہیں راہ نمائی کا مقام حاصل نہیں ہے بلکہ اسے زندگی کے ایک ایک میدان سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اس لیے موجودہ خرابیوں کا الزام اس پر ہرگز لگایا نہیں جاسکتا۔ موجودہ نظریات کو کھلے دل سے ان کی ذمے داری قبول کرنی چاہیے۔

جس شخص کی دنیا کے حالات پر نظر ہے وہ کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مذہب فساد کی جڑ ہے۔ ہمارے ملک میں جب ہنگامے ہوتے ہیں تو بلاشبہ انہیں مذہب کا رنگ دینے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان ہنگاموں میں کسی مذہب کا عقیدہ و عمل زیر بحث نہیں ہوتا بلکہ اس کے کچھ دوسرے ہی محرکات ہوتے ہیں۔

(ماہ نامہ 'زندگی نو' نئی دہلی، جولائی ۱۹۸۸ء)

---

# غلط فہمیاں فسادات کو جنم دیتی ہیں

ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات ہماری ملکی زندگی کا ایک معمول بن گئے ہیں۔ ہر چند دن بعد اس نوعیت کا کوئی نہ کوئی فساد ضرور ہوتا ہے۔ ان فسادات کے نتیجہ میں مجرم اور غلط کار تو شاید ہر طرح کے نقصانات سے محفوظ رہتے ہیں البتہ بہت سی بے قصور اور معصوم جانیں ضائع جاتی ہیں، دیکھتے دیکھتے معصوم بچے یتیم ہوجاتے ہیں، ماؤں کی بھری گودیں خالی ہو جاتی ہیں، جوان عورتوں کا سہاگ لٹ جاتا ہے، بوڑھے ماں باپ بے سہارا ہوجاتے ہیں، عفت و عصمت داغ دار ہوتی اور عزت و آبرو لٹنے لگتی ہے۔ جہاں تک مالی نقصان کا تعلق ہے ایک ایک فساد میں کروڑوں اور اربوں کا ہوتا ہے۔ فسادات کے بعد کے اثرات زیادہ تر اس طبقہ کو بھگتنے پڑتے ہیں جس کا فسادات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور جو ان سے دور رہنا چاہتا ہے اور عملاً دور رہتا ہے۔

امن و امان قائم کرنے کی ذمے داری اصلاً حکومت پر عائد ہوتی ہے، لیکن اس نے ہمیشہ اس معاملہ میں مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا ہے۔ فسادات پر قابو پانے کی اس کی طرف سے بروقت کوشش نہیں ہوتی۔ مقامی حکام پر غفلت اور جانب داری کے الزامات بار بار لگائے جاتے رہے ہیں، لیکن عام طور پر اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ پی، اے، سی امن بحال کرنے کے لیے متعین کی جاتی ہے لیکن وہ صاف طور پر جانب داری برتتی ہے۔ اس کے ظلم و بربریت کے واقعات اتنے مشہور ہو چکے ہیں کہ اس پر کوئی اعتماد باقی نہیں رہا ہے۔ فسادات سے متعلق تحقیقاتی کمیشن بٹھائے جاتے ہیں لیکن عملاً اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

ان فسادات کو بہت سے نادان افراد اور خود غرض سیاسی لیڈر مستقل ہوا دیتے رہتے ہیں۔ اخبارات اور پریس کا رویہ بھی کچھ کم اشتعال انگیز نہیں ہوتا، بلکہ اس کا ماحول تیار کرنے اور وقت ضرورت بارود کو فتیلہ دکھانے میں وہ پیش پیش رہتا ہے۔ ان ہی سب اسباب کی وجہ سے فسادات بار بار بھڑکتے ہیں اور دونوں قوموں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ فسادات اپنی کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے بڑھ ہی رہے ہیں اور اسی تناسب سے ان کے بھیانک نتائج بھی سامنے آچکے ہیں۔ اس کی بدترین مثال گجرات کا فساد ہے جو تقسیم ملک کے بعد سب سے بڑا فساد تھا۔ ان فسادات کو روکنے کی کوشش نہیں کی گئی تو یہ پورے ملک کے لیے سخت تباہ کن ہوں گے۔ آئندہ کا مؤرخ ہندستان کی تاریخ کو مختلف طبقات کی باہمی کشمکش اور تصادم کی تاریخ کی حیثیت سے پیش کرے گا اور اس بات پر اپنے صدمہ اور دکھ کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ اس ناسور نے اتنے بڑے ملک کو زہر آلود کر رکھا تھا اور اس کا ایک ایک گوشہ اس کے اثراتِ بد سے کراہ رہا تھا، لیکن وہ اس کا علاج ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ اسے ساری دنیا کی فکر تھی اور وہ ہر ایک کے غم میں بے چین نظر آتا تھا، لیکن اس نے اس سنگین مسئلہ کو حل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جس سے اس کا اپنا گھر اجڑ رہا تھا۔

فسادات میں جان، مال اور عزت و آبرو جس طرح لٹتی ہے، اس سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی، مذہب، اخلاق اور تہذیب و شرافت کی توہین ہے۔ یہ وہ کوتاہی ہے جس کی تلافی آسانی سے نہیں ہوسکتی۔ اس پر تو ہر باضمیر انسان کو تڑپ اٹھنا چاہیے اور اس بات کا حلف لینا چاہیے کہ وہ اپنے حدود میں آئندہ کبھی فساد ہونے نہیں دے گا اور اس مقصد کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے بھی تیار رہے گا۔ لیکن افسوس کہ اس ملک کے معاشی، سیاسی، تعلیمی، تہذیبی غرض کہ ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر سوچنے اور لکھنے بولنے والے تو بہت ہیں، لیکن فسادات اور ان سے پیدا ہونے والی تباہی پر صحیح رخ سے سوچنے والے بھی کم ہی نظر آتے ہیں اور ان لوگوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، جن میں اظہارِ حق کی جرأت ہو اور جو صحیح بات کہہ سکتے ہوں۔

ہندو مسلم فسادات اس ملک کی اکثریت اور سب سے بڑی اقلیت کے درمیان

ہوتے ہیں۔ اکثریت اس بات پر خوش ہوتی ہے کہ ان فسادات میں اقلیت کا زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ کبھی اکثریت کا زیادہ نقصان ہوتا ہے تو اقلیت خوشی محسوس کرتی ہے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ یہ اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ نہیں پورے ملک کا مسئلہ ہے۔ مرنے والوں میں ایسے استاد، ڈاکٹر، وکیل، تاجر، صنعت کار اور ماہرینِ تعلیم بھی ہو سکتے ہیں جو صرف اپنے گروہ کے لیے نہیں پورے ملک کے لیے سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہوں، اور ان کے وجود سے پورے معاشرہ کو فائدہ پہنچ سکتا ہو؟ کیا ان کی جان لے کر اس لیے خوشی منائی جاسکتی ہے کہ ان کا کسی خاص گروہ سے تعلق ہے، اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہماری سماجی زندگی میں کمانے والے ایک ایک فرد کی اہمیت ہے۔ خاندان میں ایک فرد کماتا ہے اور اس پر پانچ دس افراد کا معاشی انحصار ہوتا ہے۔ اس ایک فرد کے ختم ہوجانے کا مطلب یہ ہے کہ پورا خاندان بے سہارا ہوگیا اور ملک کی ذمے داریوں میں اسی تناسب سے اضافہ بھی ہوا۔ اگر ملک ان ذمے داریوں کو ادا نہ کرے تو اس کے اور زیادہ شدید نتائج نکل سکتے ہیں۔ ہندو مسلم دشمنی کے جذبہ کی وجہ سے بعض اوقات آدمی یہ سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا کہ ان فسادات کا ملکی معیشت پر کتنا تباہ کن اثر پڑتا ہے۔ مکانوں اور دکانوں، کارخانوں اور ضروریاتِ زندگی کے ذخیروں کو نذرِ آتش کرنا، ملکی دولت کو آگ لگانے کے ہم معنی ہے۔ اس پر وہی شخص مسرت محسوس کرسکتا ہے جو جذبات میں اندھا ہوچکا ہو اور جسے ملکی مفاد سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

یہ ملک اپنے ذہن و مزاج کے لحاظ سے امن پسند ہے۔ یہاں کی اکثریت فساد چاہتی ہے اور نہ اقلیت۔ دونوں ہی اس سے دور رہنا چاہتی ہیں۔ لیکن ان ہی میں کا ایک طبقہ ہے جو فسادات اور ہنگاموں میں پیش پیش رہتا ہے۔ اسے اکثریت سے ہمدردی ہے اور نہ اقلیت سے۔ وہ محض اپنی ذاتی اغراض اور مفادات کے لیے یہ سب کچھ کرتا رہتا ہے۔ عام حالات میں یہ طبقہ ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے، لیکن فسادات کے دوران اس کی حکم رانی قائم ہوجاتی ہے اور ہر فساد کو بہت جلد وہ ہندو مسلم مسئلہ بنانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ملک کی دونوں بڑی قومیں ــــ ہندو اور مسلمان ــــ شدید غلط فہمیوں اور

بدگمانیوں کے ماحول میں جی رہی ہیں۔ ہر فریق دوسرے سے خوف و ہراس محسوس کرتا ہے۔ اس ماحول میں جو بھی افواہ پھیلائی جاتی ہے اس پر یقین کرلیا جاتا ہے، کسی بھی طرف سے ذرا سی بے احتیاطی اور اشتعال انگیزی دوسرے کو بے قابو کر دیتی ہے۔ اسی کم زوری سے فساد کرنے والے فساد کرتے ہیں اور دونوں طبقات کو لڑاتے رہتے ہیں۔

جب تک یہ غلط فہمیاں دور نہ ہوں، فسادات کا سلسلہ شاید رک نہیں سکتا۔ مسلمانوں کو یہاں کے ہندو بھائیوں کے بارے میں جو شبہات اور خدشات ہیں انھیں ان کا کوئی نمائندہ ہی دور کرسکتا ہے، البتہ مسلمانوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کے ذیل میں بعض باتیں عرض کی جارہی ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی بعض شکایات کا بھی ذکر کیا جارہا ہے تاکہ سنجیدگی سے ان پر غور کیا جاسکے۔

ایک بڑی غلط فہمی، جسے صریح الزام کہنا چاہیے، یہ ہے کہ سارا بگاڑ اسلام کا ہے۔ اس نے اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان ایک خلیج پیدا کردی ہے۔ وہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف ابھارتا اور رواداری اور محبت کی جگہ تعصب، نفرت، عداوت اور بے زاری کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو مستقل حالتِ جنگ میں رکھتا ہے اور تصادم اور ٹکراؤ کی طرف لے جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس بارے میں قرآن و حدیث کے صریح احکام ہیں۔ ان احکام کے ہوتے ہوئے دونوں طبقات اتحاد و اتفاق اور محبت و یگانگت کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔

یہ الزام اس کتاب پر لگایا جاتا ہے جس نے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی عفوو درگزر کی تعلیم دی ہے، جو اپنے ماننے والوں کو صبر کی تاکید اور تحمل و برداشت کی تلقین کرتی ہے۔ صبر کا ایک پہلو یہ ہے کہ آدمی حق و صداقت پر ثابت قدم رہے اور مخالفین کا سخت سے سخت رویہ بھی اسے جذبات میں مشتعل یا بے قابو نہ کردے۔ یہ تعلیم قرآن مجید کے صفحات پر اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ ایک عام قاری کی نگاہ سے بھی اوجھل نہیں رہ سکتی، لیکن اس کے باوجود اسے بالکل نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ اسلام سے بدگمان کرنے اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے ان احکام کا سہارا لیا جاتا ہے جو خاص حالات میں اسلامی ریاست کو دیے گئے ہیں۔

دنیا کی ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست بھی امن اور جنگ دونوں حالتوں سے دوچار ہوسکتی ہے۔ ان دونوں کے احکام الگ ہیں۔ اگر اسلامی ریاست کے لیے جنگ ناگزیر ہوجائے ـــ قرآن مجید نے جنگ کے اسباب و شرائط سے بھی بحث کی ہے اور امن کے حالات سے بھی ـــ تو اس کی ہدایت ہے کہ پامردی اور ہمت کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا جائے اور بزدلی اور پست ہمتی نہ دکھائی جائے۔ اسلامی ریاست کو حالت جنگ میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے بارے میں یہ سمجھنا یا سمجھانے کی کوشش کرنا بڑی زیادتی ہے کہ ہر فرد ان کا مخاطب ہے اور جس کا جی چاہے اور جب چاہے جنگ کا اعلان کرسکتا ہے۔ دنیا کے ہر دستور میں جنگ سے متعلق ہدایات ہوتی ہیں، لیکن یہ فیصلہ کرنا ریاست کا کام ہوتا ہے کہ جنگ کی جائے یا نہ کی جائے اور کی جائے تو کب کی جائے اور کب ختم کی جائے؟ ریاست کے اس اختیار کو افراد اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے۔

کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں احساسِ برتری ہے اور یہی چیز ان کو اتحاد اور یگانگت سے دور رکھتی ہے۔

مسلمانوں کے احساسِ برتری کا مطلب اگر یہ ہے کہ وہ اسلام کی برتری کے قائل ہیں اور انھیں اسلام کی تعلیمات، اس کی اقدار، اس کی تہذیب، اس کے علوم وفنون اور دنیا پر اس نے جو احسانات کیے ہیں ان پر ناز ہے تو اس کی کسی کو شکایت نہیں ہونی چاہیے، اس لیے کہ یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ ہر قوم کو اپنے مذہب اور تہذیب پر ناز ہوتا ہے۔ ہندو قوم کو بھی اپنے قدیم ورثہ، اپنی سنسکرتی اور اپنے علوم وفنون پر ناز ہے۔ وہ اپنے پوروجوں کی بزرگی اور عظمت کے چرچے کرتی ہے اور ان کے کارناموں کو فخر کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس کا اسے حق حاصل ہے۔ البتہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی تہذیب اور کلچر دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرے یا ان سے اپنی تہذیب سے دست بردار ہوجانے کا مطالبہ کرے۔ اسے تہذیبی جارحیت کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی کسی جارحیت کا جذبہ مسلمانوں میں نہیں ہے، البتہ انھیں یہ شکایت ہے کہ وہ تہذیبی جارحیت کا شکار بنائے جا رہے ہیں اور انھیں اپنے ماضی سے بیگانہ بنانے اور اس سے

کاٹ دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس شکایت کو دور کرنا یہاں کی اکثریت کا کام ہے۔

مسلمانوں کے احساسِ برتری کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ انھوں نے یہاں کئی صدیوں تک حکومت کی ہے، اس لیے ان کی نفسیات حکم رانوں کی نفسیات بن گئی ہیں۔ وہ ذہنی طور پر دوسروں کو مساوی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اس وجہ سے ان کے ساتھ ان کا رویہ بھی غلط ہو جاتا ہے۔

یہ تجزیہ صحیح نہیں ہے۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اس کی زد خود یہاں کی اکثریت پر پڑتی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے، لیکن اس سے پہلے ایک طویل عرصہ تک یہاں کی اکثریت کو حکومت و اقتدار حاصل رہا ہے۔ اس میں بڑے بڑے بادشاہ پیدا ہوئے، بڑی خدمات انجام پائیں اور ہندستان کو متحد اور مضبوط بنانے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ یہ ساری چیزیں اکثریت کے اندر بھی احساسِ برتری پیدا کرسکتی ہیں۔ جہاں تک آزادی کے بعد کے دور کا تعلق ہے، اس میں اکثریت ہی عملاً حکومت کے درو بست پر قابض ہے۔ اس وجہ سے ان کے اندر احساسِ برتری کا پایا جانا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اکثریت کے اندر فی الواقع اپنی برتری کا احساس پایا جاتا ہے اور وہ حکومت کے نشہ میں بے اعتدالیاں کر رہی ہے۔

مسلمانوں کے بارے میں ایک بات یہ بھی کہی جا رہی ہے کہ اس ملک میں وہ حملہ آوروں کی حیثیت سے آئے، قتل و خون ریزی کی، یہاں کی آبادی کو زبردستی مسلمان بنایا، ان کے مندروں کو مسمار کر کے مسجدوں میں تبدیل کر دیا، ان سے اقتدار چھینا اور انھیں محکوم بنائے رکھا۔ غرض یہ کہ مسلمانوں نے ہندستان میں ظلم کی ایک تاریخ مرتب کردی۔

یہ شکایت دراصل مسلمان سلاطین اور بادشاہوں سے ہے، لیکن اسے اس طرح پیش کیا جاتا ہے جیسے پوری قوم سے شکایت ہو۔ حالاں کہ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ کسی قوم کے فلاں گروہ نے غلطی کی ہے تو بھی اس کے لیے پوری قوم کو مجرم نہیں قرار دیا

جاسکتا۔ یہ اسی نوعیت کی شکایت ہے جس نوعیت کی شکایت یہاں کے دراوڑوں کو آریوں سے ہے لیکن ہم فی الحال اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ ان کی شکایت صحیح ہے یا غلط اور انھیں شکایت کا حق ہے یا نہیں، البتہ مسلمان سلاطین سے متعلق بعض باتیں عرض کرنا چاہیں گے۔

یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ ہندستان کے مسلمان سلاطین سب کے سب فرشتہ صفت تھے اور ان سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ ان سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہوں گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے ظلم و ستم کی جو داستانیں بیان کی جاتی ہیں تاریخ سے ان میں سے بیشتر کا ثبوت فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ داستانیں مسلمانوں کی تاریخ کو داغ دار بنانے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کے بیج بونے کے لیے گھڑی گئی ہیں۔ ان کو آنکھ بند کرکے قبول کرلینا اور ان پر اصرار کرنا ایک ناپاک مقصد میں تعاون کرنا اور دشمن کے منصوبہ کو کامیاب بنانا ہے۔

ان بادشاہوں نے عدل و انصاف، رواداری، غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت، ان کے مذہب کی آزادی اور اس کے احترام کی بھی شان دار مثالیں قائم کی ہیں۔ انتظامی معاملات میں عدمِ تعصب اور فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ غیر مسلموں کو اعلیٰ مناصب عطا کیے ہیں۔ جنگی مہمات میں ان پر اعتماد کیا ہے اور اتنے بڑے پیمانے پر جاگیروں اور عطیوں سے نوازا ہے کہ ہندستان کا کوئی بھی مؤرخ آسانی سے انھیں نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ان کی یہ خوبیاں واقعہ یہ ہے کہ آج کے دورِ جمہوریت کے لیے بھی نمونہ بن سکتی ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان بادشاہوں کے کم زور پہلوؤں کو دیکھنے کی جگہ ان کی ان ہی خوبیوں کو دیکھنا چاہیے اور انھیں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بعض لوگ بہت ہی سادہ لوحی کے ساتھ یہ کہہ دیتے ہیں کہ مسلمان اپنے سلاطین سے براءت اور بے زاری کا اعلان کردیں۔ ظاہر ہے یہ اعلان ان کی مفید خدمات سے تو نہیں ہوسکتا، ان کے غلط کاموں سے ہوگا۔ اس کے لیے ان الزامات کی چھان بین کرنی ہوگی جو ان پر لگائے جاتے ہیں۔ یہ تحقیق صرف مسلمان حکم رانوں کے

عہدِ حکومت ہی کی نہیں ہوگی بلکہ ہندستان کی پوری تاریخ کی ہوگی جو ہزارہا سال کی مدت پر پھیلی ہوئی ہے۔ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ یہاں کے کسی بھی حکم راں نے کسی قوم یا گروہ کے ساتھ ناانصافی اورزیادتی کی تھی تو اس سے اس کی قوم اپنی بے زاری اور براءت کا اعلان کرے گی۔ اس طرح کا مطالعہ صدیوں اور ہزاروں سال پہلے کے حکم رانوں کے جرائم اور ان کے جور وستم کو سامنے لاسکتا ہے، اس لیے کہ کوئی بھی قوم اپنی معصومیت اور بے گناہی کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ اس سے کوئی اخلاقی اور سماجی فائدہ تو نہیں حاصل ہوگا، البتہ ہرقوم اس احساس میں مبتلا ہوجائے گی کہ اس نے بڑے بڑے مجرم پیدا کیے ہیں اور آج ان کی غلطیوں کی اس سے توبہ کرائی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی زندہ قوم اس ذلت کو گوارا نہیں کرسکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ سبق حاصل کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہے تاکہ ماضی میں جو غلطیاں یا فروگزاشتیں ہوئی ہیں ان سے بچنے کی کوشش کی جائے اور جو خوبیاں موجود تھیں انھیں جہاں تک ہوسکے اختیار کیا جائے۔ تاریخ کے مطالعہ کا یہ مقصد کبھی نہیں ہوتا کہ جن افراد سے ماضی میں غلطیاں ہوئیں صدیوں کے بعد ان کی قوموں کو نشانۂ ملامت بنایا جائے یا اس کا حساب کتاب چکایا جائے۔ اس طرح پوری دنیا حساب دینے اور حساب لینے میں لگ جائے گی۔

اس ملک کی اکثریت کو جس طرح یہاں کے مسلم حکم رانوں سے شکایت ہے اسی طرح عام مسلمانوں سے بھی شکایات ہوسکتی ہیں اور ہیں، لیکن اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان شکایات کے نتیجہ میں اسلام ہی سے سوئے ظن اور بدگمانی پائی جاتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ یہ شکایتیں صحیح ہیں یا غلط، ان کی بنیاد پر اسلام ہی سے بدگمان ہوجانا درست نہیں ہے۔

اسلام کچھ اصول و نظریات کا نام ہے۔ یہ ایک آئیڈیا لوجی (Ideology) ہے۔ مسلمان اس کے ماننے والے (Believers) ہیں۔ ضروری نہیں کہ کسی نظریہ کے ماننے والوں کا عمل اس کے عین مطابق ہو۔ ان کی زندگی میں اس سے انحراف بھی پایا جاسکتا ہے۔ اس انحراف کے بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں۔ اس کے باوجود ان پر اس پہلو

سے تنقید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس نظریہ کے تقاضے نہیں پورے کر رہے ہیں، لیکن ان کے انحراف سے اس نظریہ کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا جاسکتا۔ اسلام کے ماننے والوں میں بھی بہت سی کم زوریاں ہیں۔ ان کی یہ کم زوریاں ان کی غفلت اور کوتاہی کا ثبوت ہیں۔ یہ اسلام کی کسی خامی کا ثبوت نہیں ہیں۔

یہی معاملہ مسلمان حکم رانوں اور فرماں رواؤں کا ہے۔ وہ اسلام کے مکمل نمائندے نہیں تھے۔ ان کے بہت سے کام اسلام کے مطابق ہوتے تھے اور بہت سی چیزیں اسلام کے خلاف بھی ان کی زندگیوں میں پائی جاتی تھیں۔ جو لوگ ان سے شاکی ہیں وہی لوگ مسلمان علما، صلحا اور صوفیا سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، جن کو بڑی حد تک ہم اسلام کے نمائندے کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شکایتیں سیاسی نوعیت کی ہیں۔ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن جب فتنہ وفساد کی آگ بھڑکتی ہے تو آدمی اس سادہ سی حقیقت کو بھول جاتا ہے اور اسلام بھی اس تنقید کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔

یہاں مسلمان سلاطین اور ہندو راجاؤں کے درمیان جو جنگیں ہوئیں، بعض اوقات انھیں کفر و اسلام کی جنگوں کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ جنگیں نہ تو ہندومت کے بچاؤ اور تحفظ کے لیے لڑی گئیں اور نہ اسلام کی سربلندی ان کا مقصد تھا۔ یہ ملک گیری اور اپنی سلطنتوں کی توسیع اور استحکام کے لیے لڑی جاتی رہیں۔ یہ کبھی ہندو راجاؤں اور مسلمان بادشاہوں کے درمیان ہوئیں، کبھی خود مسلمان بادشاہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہے اور کبھی دونوں طرف ہندو راجا تھے۔ ان جنگوں کو ہندومت اور اسلام کی جنگیں قرار دینا اور پھر ان کی روشنی میں اسلام یا ہندومت کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا صریح زیادتی ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اس طرح کی اور بھی غلط فہمیاں ہیں۔ ان غلط فہمیوں کو دور ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر نہ تو اسلام کو صحیح شکل میں سمجھا جاسکے گا اور نہ مسلمانوں کے بارے میں یہاں کی اکثریت کی رائے بدلے گی۔

(ماہ نامہ 'زندگی نو' نئی دہلی، مئی ۱۹۸۹ء)

# یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟

اس وقت ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی جو بھیانک لہر چل رہی ہے اسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ جارحیت پسند تنظیموں کو یہاں اپنے حوصلے پورے کرنے کی چھوٹ مل گئی ہے۔ ان کے عزائم کی تکمیل کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، قانون اور نظم و ضبط ان کے سامنے بے بس ہے، وہ جس جگہ چاہیں فساد کرا سکتے ہیں اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوسکتا ہے۔ فسادات اس ملک کی قسمت بن گئے ہیں۔ آج یہاں فساد ہے کل وہاں۔ لیکن اتنے بدترین فسادات ملک کی آنکھوں نے کم ہی دیکھے ہوں گے۔ انھوں نے تقسیمِ ملک کے نتیجہ میں ہونے والے فسادات کی یاد تازہ کردی ہے۔ یہ فسادات بتاتے ہیں کہ انسان بربریت پر اتر آتا ہے تو درندوں اور بھیڑیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

ہمارے اس ملک میں بہت سے مذاہب کے ماننے والے موجود ہیں۔ دستور کی رو سے ان سب کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے اور عبادت گاہ بنانے کا حق حاصل ہے ــــــ لیکن دنیا کے کسی مذہب نے اس کی اجازت نہیں دی کہ دوسرے مذہب کی عبادت گاہیں زبردستی اور اپنی طاقت کے بل پر منہدم کردی جائیں اور ان کی جگہ اپنی عبادت گاہیں کھڑی کی جائیں۔ دنیا نے ظلم و بربریت کے مظاہرے بہت دیکھے ہیں۔ اس کے لیے مذہب کو استعمال کرنا اسے رسوا کرنا ہے۔ افسوس کہ اس ملک میں یہی ہو رہا ہے اور مذہب کے علم برداروں کے ذریعے ہو رہا ہے۔

ہر شخص کو اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے اور اسے عام کرنے کے لئے تعلیم و تلقین اور تبلیغ کا حق ہے، لیکن اگر اس میں تشدد اور جارحیت شامل ہوجائے تو وہ اپنا یہ حق

کھو دیتا ہے۔ پھر ہر مہذب معاشرہ اور ہر شریف شہری کا فرض ہوجاتا ہے کہ اس کے خلاف کھڑا ہوجائے اور جب تک جارحیت سرنگوں نہ ہوجائے اس وقت تک اپنی جنگ جاری رکھے۔ یہ دیکھ کر صدمہ ہوتا ہے کہ جارحیت کا ننگا ناچ جاری ہے اور پورے ملک میں کسی ایک فرد میں بھی یہ ہمت و حوصلہ نہیں ہے کہ اس کے سامنے آئے اور اسے چیلنج کرے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جارحیت کا یہ دیو کس کو کب نگل جائے گا اور کون اس سے بچا رہے گا؟

جمہوریت میں آزادی کا ایک تقاضا یہ سمجھا جاتا ہے کہ مذہبی اجتماعات اور جلسے جلوسوں پر پابندی نہ عائد کی جائے، لیکن ان جلسوں کو اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے، دوسروں کے جذبات کو مجروح اور مشتعل کرنے اور ان پر حملہ کرنے کا بہانہ بنالیا جائے تو ملک کی سا لمیت کا تقاضا ہے کہ ان پر پابندی لگادی جائے۔ ظلم کو کھل کر کھیلنے کا موقع فراہم کرنا پورے ملک کو تباہی کی طرف لے جانا ہے۔ جب کسی گروہ کو جارحیت، قتل و غارت گری اور خوں آشامی کا چسکا لگ جائے تو ہر کم زور اس کا ہدف ہوتا ہے۔ وہ اپنے اور پرائے کا کوئی فرق نہیں کرتا۔ جارحیت کے ذہن و مزاج اور اس کے نتائج کو بروقت محسوس نہ کیا جائے تو پورا ملک اس کی لپیٹ میں آسکتا ہے اور اس آگ کا بجھانا کسی کے لیے بھی آسان نہ ہوگا۔

اس جارحیت کی ایک نمایاں مثال بابری مسجد اور اس سے ملحقہ زمین کا تنازعہ ہے۔ یہ تنازعہ اس وقت عدالت میں ہے۔ دنیا کے ہر مہذب سماج میں ملکیت کے تنازعات میں عدالت کے فیصلوں کو آخری حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ کسی فریق کا اس حد تک آگے بڑھ جانا کہ وہ اپنے خلاف عدالت کے فیصلے کو بھی تسلیم نہیں کرے گا، کھلی ہوئی جارحیت ہے۔ یہ قانون کی بالادستی کا کھلم کھلا انکار ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ وہ طاقت کے زور سے اپنی بات منوانا اور اپنے منصوبہ پر عمل کرنا چاہتا ہے۔ وہ جنگل کے قانون پر یقین رکھتا ہے، جہاں عدل و انصاف کا نہیں زور زبردستی کا راج ہوتا ہے۔ اس رجحان پر بند نہ باندھا جائے تو کسی کے حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے۔ حق اس کا ہوگا جس کے ہاتھ میں

طاقت ہوگی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ فسادات مذہب کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ مذہب کا سوال جب درمیان میں آجاتا ہے تو جذبات میں شدت پیدا ہوجاتی ہے۔ ورنہ یہ کیفیت نہ ہوگی۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان فسادات کا تعلق مذہب سے ہرگز نہیں ہے۔ دنیا کے کسی مذہب نے بستیوں کو اجاڑنے، آبادیوں کو ویرانوں میں تبدیل کرنے، مکانوں، کھیتوں اور کارخانوں کو اجاڑنے اور بارونق بازاروں کو راکھ کا ڈھیر بنادینے کی تعلیم نہیں دی ہے۔ مذہب انسانوں کو محبت کے رشتے میں باندھتا اور ہم دردی اور خیر خواہی کا سبق دیتا ہے۔ مذہب ظلم کی راہ نہیں دکھاتا۔ البتہ انسان اپنی درندگی اور بہیمیت کو چھپانے کے لیے مذہب کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔

اب تو جارحیت کو مذہب کے نام کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آزادی کے بعد سے اردو کو دبانے اور ختم کرنے کی کوشش جاری تھی۔ اردو بولنے والوں کا مسلسل مطالبہ تھا کہ اردو کو اس کا جائز حق دیا جائے۔ ان کا یہ مطالبہ جائز اور قانونی حدود میں تھا۔ اترپردیش کی حکومت نے ابھی حال میں اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہوسکتا ہے یہ فیصلہ اردو بولنے والوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے کیا گیا ہو، لیکن اس کا بہر حال کسی خاص فرقہ سے تعلق نہیں تھا۔ اردو بولنے والوں میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہیں اور پورے ملک میں یہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اترپردیش تو ہمیشہ سے اس کا مرکز رہا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اسے صرف مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا ہے۔ چناں چہ حکومت اترپردیش کے اعلان کے ساتھ فسادات شروع ہوگئے۔ بدایوں میں اس مسئلہ پر جس طرح کشت وخون کا بازار گرم ہوا اور جس طرح ٹرین پر حملہ کرکے نہتے مسافروں کو شہید کیا گیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں کا جارحیت پسند طبقہ دوسروں کو ان کے جائز اور آئینی حقوق بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ملکی نقطۂ نظر سے تشویش اور پریشانی کی بات یہ ہے کہ ان واقعات پر پورے ملک کو تڑپ اٹھنا چاہیے تھا اور اس کے ہم دردوں اور بہی خواہوں کی نیند اڑ جانی چاہیے

تھی، لیکن یہ دیکھ کر دل دکھتا ہے کہ اس پر جو کرب اور بے چینی پائی جانی چاہیے تھی وہ مفقود ہے۔ حالات کی سنگینی اور نزاکت کا یا تو احساس نہیں ہے یا قصداً اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہ کسی گروہ کا مسئلہ نہیں، بلکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے۔ یہ بے حسی اور مجرمانہ غفلت پورے ملک کو لے ڈوبے گی۔

ملک کے کسی گوشے میں ہریجنوں پر زیادتی ہوتی ہے تو ہر طرف ہل چل مچ جاتی ہے۔ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ایوان صدائے احتجاج سے گونجنے لگتے ہیں۔ یقیناً ظلم کے خلاف یہی جذبات ہونے چاہئیں، لیکن بھاگل پور، مونگیر، سیتا مڑھی اور بدایوں کی زمین ظلم و زیادتی سے چیخ اٹھی اور انسانیت کو، رحم و کرم اور عدل و انصاف کو برابر آواز دیتی رہی اور جب انسانی حقوق کے علم بردار اور قانون کے نگہبان متوجہ نہ ہوئے تو خاموش ہوگئی۔ کیا یہ خاموشی دلوں کو دہلا دینے کے لیے کافی نہیں ہے؟ ان ہول ناک واقعات پر جن افراد اور جماعتوں نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا اور عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے، ان سب کا شکر گزار ہونے کے بعد یہ سوال کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ کیا یہ واقعات صرف اسی ردعمل کے متقاضی تھے یا ان کا مطالبہ کچھ اس سے زیادہ کا تھا؟

بوفورس اسکینڈل ایک عرصہ سے اخبارات پر چھایا ہوا ہے۔ ہندستان سے لے کر سوئزر لینڈ تک اس کی چھان بین ہو رہی ہے، دستاویزات فراہم کی جا رہی ہیں۔ مضامین اور اداریے لکھے جا رہے ہیں۔ اس پر مجموعی طور پر بلا مبالغہ سیکڑوں صفحات سیاہ ہو چکے ہیں۔ اسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں ملک کے غم میں گھلی جا رہی ہیں، اس کی فلاح و بہبود کے لیے بے چین ہیں، وہ کروڑوں کے دھوکہ وفریب کا پردہ چاک کر دینا چاہتی ہیں۔ اس ملک کے مالی نقصان اور اس کے ساتھ کی جانے والی فریب کاری کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بلاشبہ یہ اسکینڈل ہے تو اسے ضرور سامنے آنا چاہیے۔ یہ ملک کی بھلائی اور خیر خواہی کا تقاضا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتر پردیش ، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور ملک کی دوسری ریاستوں کے حالیہ فسادات کی اتنی بھی اہمیت نہیں ہے جتنی بوفورس اسکینڈل کی ہے؟ ان فسادات میں

سیکڑوں جانیں گئیں، اس سے کئی گنا افراد مجروح اور معذور ہوئے، مکانات مسمار ہوئے، بستیاں اجڑیں، کاروبار تباہ ہوئے، کروڑوں کا مالی نقصان ہوا۔ ان لوگوں کا ذکر ہی نہیں جو لاپتہ ہیں اور جن کا حشر کسی کو معلوم نہیں۔ کیا یہ سب بوفورس سے کم ہے؟ کیا اس کے لیے بھی وہی بے چینی اور تڑپ پائی جاتی ہے؟ اگر ملک کی بھلائی پیش نظر ہے تو اس فرق و امتیاز کی آخر وجہ کیا ہے؟

اس پورے معاملہ کو ہماری سیاسی پارٹیوں نے صرف اس نقطۂ نظر سے دیکھا کہ اس سے الیکشن میں کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ برسر اقتدار پارٹی نے مخالف پارٹیوں کو موردِ الزام قرار دیا ہے کہ وہ فرقہ واریت کو ہوا دے رہی ہیں اور تصام اور ٹکراؤ کی فضا پیدا کر رہی ہیں۔ مخالف پارٹیاں حکومت اور انتظامیہ کو ذمے دار قرار دیتی ہیں۔ کسی میں یہ ہمت نہیں کہ ظلم کے خلاف سینہ سپر ہو، ظالم کے خلاف زبان کھولے اور مظلوم کی حمایت میں آواز اٹھائے۔ بڑے سے بڑا سیاسی لیڈر بھی زبان سے ہمدردی کا ایک لفظ نکالنے سے پہلے ہزار بار سوچتا ہے کہ اس کا اس کے سیاسی کیریئر پر کیا اثر پڑے گا؟ مظلوم کی حمایت اور ظالم کی مخالفت کرکے اپنی سیاسی حیثیت کو داؤ پر لگانا نہیں چاہتا۔ ملک کی تمام بڑی سیاسی پارٹیاں اکثریت کے شدید دباؤ میں ہیں۔ اقلیت کی خاطر اسے ناخوش کرنے کی ہمت ان میں سے کسی میں نہیں ہے۔ ان حالات میں مسلمان کسی بھی پارٹی سے کوئی بڑی توقع وابستہ نہیں کرسکتے۔ انھیں اپنے مسائل خود حل کرنے ہوں گے۔ اس کے لیے اپنے وجود کا تحفظ، دین و ایمان پر ثابت قدمی، صبر و تحمل، عزم و حوصلہ اور بے پناہ جرأت و ہمت کی ضرورت ہوگی اور ایسی دور رس حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی کہ یہاں وہ اپنے وجود کو بھی باقی رکھ سکیں اور خیرِ امت کی حیثیت سے اس ملک کی راہ نمائی اور قیادت بھی کرسکیں۔

یہ سطریں ۷؍نومبر ۱۹۸۹ء کو لکھی گئی ہیں۔ جنرل الیکشن سر پر ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے چھپتے چھپتے حالات کیا رخ اختیار کریں گے اور ملک کا کیا نقشہ بنے گا؟

(ماہ نامہ 'زندگی نو' نئی دہلی)

# اہلِ مذاہب سے بعض گزارشات

یہ ایک حقیقت ہے اور بہت ہی درد ناک حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں مذہب کے نام پر بار بار ایسی فضا پیدا کردی جاتی ہے کہ عوام کا ایک طبقہ عقل وخرد کا دامن چھوڑ بیٹھتا ہے اور فسادات، ہنگاموں، قتل وخون اور توڑ پھوڑ کا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ فسادات اور ہنگاموں کی آگ جہاں بھڑکتی ہے بالعموم وہیں تک محدود نہیں رہتی بلکہ دور دراز کے مقامات بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

یہ صورتِ حال کسی متعین مذہب کے لیے ہی نہیں بلکہ نفس مذہب کے لیے تشویش ناک ہے، اس کی وجہ سے مذہب پر سے اعتماد اٹھتا جا رہا ہے، ملک کے سنجیدہ افراد یہ تاثر لینے پر مجبور ہوسکتے ہیں، بلکہ ہو رہے ہیں کہ مذہب ایک جنون ہے، یہ محض تخریب اور فساد کا ذریعہ ہے، اس سے انسان کی فلاح و بہبود کی توقع نہیں کی جاسکتی اور اس سے دور رہنے ہی میں عافیت ہے۔ ہوسکتا ہے یہ مذہب کے خلاف ایک سازش اور اسے بدنام کرنے کی ترکیب ہو۔ اس پر اہل مذاہب کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے اور اس کے دفاع کی تدبیر کرنی چاہیے۔

اس صورتِ حال کے مختلف اسباب ہوسکتے ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ مذہب، سیاست پیشہ افراد کا آلۂ کار بن کر رہ گیا ہے۔ ملک کی قیادت تو بہت بڑی بات ہے، یہاں اس سے بحث نہیں ہے، محدود معنی میں مذہب کی قیادت بھی ان لوگوں کے ہاتھ

میں نہیں ہے جو اس سے مخلصانہ اور بے غرض تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی قیادت عملاً وہ لوگ کر رہے ہیں جن کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے، ان کی زندگیاں اس کی تعلیمات سے خالی ہیں، وہ اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے دروغ گوئی سے کام لے سکتے ہیں، غیروں ہی کو نہیں اپنوں کو بھی فریب دینے میں وہ کوئی تکلف یا تردد نہیں محسوس کرتے، کم زور ان کے ظلم کا نشانہ ہوتے ہیں اور جی بھر کر ان کا استحصال کرنے میں انھیں کوئی تأمل نہیں ہوتا۔ یہی لوگ فتنہ و فساد میں آپ کو پیش پیش ملیں گے۔ انھیں مذہب سے کوئی ہمدردی نہیں ہے بلکہ اپنے مفادات کے لیے وہ سرگرداں ہیں اور مذہب کو اس کا ذریعہ بنائے بیٹھے ہیں۔

اس صورتِ حال کا دوسرا سبب یہ ہے کہ یہاں کے عوام کی اکثریت خود اپنے مذہب، اس کی تعلیمات اور اس کے تقاضوں سے بے خبر ہے۔ اسے مذہب سے بس ایک طرح کا جذباتی تعلق ہے، اس وجہ سے مذہب کے نام پر اسے آسانی سے جمع بھی کیا جاسکتا اور مشتعل بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کے اس جذبہ سے مفاد پرست فائدہ اٹھا رہے ہیں اور مذہبی نعروں کے ذریعہ عوام کو گم راہ کر رہے ہیں۔ عوام کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ کون مذہب کے معاملے میں مخلص ہے اور کون اس کا استحصال کر رہا ہے؟

یہ سارے ہنگامے مذہب کے نام پر ہوتے ہیں، اس لیے مذہب سے بے غرض اور مخلصانہ تعلق رکھنے والے افراد، جماعتوں اور اس کے بہی خواہوں کی ذمے داری بڑھ جاتی ہے۔ یہ ان کا اولین فرض ہے کہ مذہب کی تصویر کو بگڑنے نہ دیں۔ یہاں کے عوام و خواص کو بتائیں کہ مذہب ظلم و بربریت کو پھیلانے کے لیے نہیں، اسے مٹانے کے لیے آیا ہے، اس نے عداوت و نفرت کا نہیں محبت اور اخوت کا درس دیا ہے، وہ ظلم کو مٹانا اور عدل و انصاف کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ آنی چاہیے اور ہر گوشہ سے آنی چاہیے کہ دنیا کے کسی مذہب نے قتل و خوں ریزی، عصمت دری اور لوٹ مار کا حکم نہیں دیا، کسی مذہب نے یہ سبق نہیں پڑھایا کہ بے گناہوں کو بے دردی کے ساتھ

قتل کر دیا جائے، معصوم بچوں کے گلے کاٹ دیے جائیں، آباد گھروں میں آگ لگادی جائے، راہ گیروں پر حملے ہوں اور انھیں خنجروں اور گولیوں کا نشانہ بنایا جائے، نہتے اور بے یار و مددگار مسافروں کو اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے ختم کر دیا جائے، انسان اپنی انسانیت کا جامہ اتار پھینکے اور درندہ بن جائے، اس کی بہیمیت اور درندگی کے نتیجہ میں جوان عورتوں کے سہاگ لٹ جائیں، ان کی ردائے عفت و عصمت برسرِ عام تار تار ہونے لگے، معصوم بچے یتیم اور بے آسرا ہوجائیں اور بوڑھے ماں باپ، اپنے سہارے کھوبیٹھیں۔ جس شخص کا مذہب سے ذرّہ برابر بھی تعلق ہو اس سے اس شقاوت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ اس پاپ کے تصوّر ہی سے لرز اٹھے گا۔

یہ بات صرف زبان کی حد تک نہ ہو، بلکہ مذہب کے حقیقی پیروکاروں کو فتنہ و فساد کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوجانا چاہیے۔ جو لوگ مفسد، فتنہ پرداز اور فسادات میں ملوث ہوں ان کے سیاہ چہروں پر سے نقاب اتار دینی چاہیے اور انھیں دنیا کے سامنے عریاں کر دینا چاہیے کہ یہ غرض کے بندے اور مفادات کے غلام ہیں، ان کا دین دھرم سے کوئی تعلق نہیں ہے اور انھیں ان کے جرائم کی سزا لازماً ملنی چاہیے۔ انھیں معاشرہ سے الگ تھلگ کر دیا جائے اور مذہب کے استعمال کی اجازت نہ دی جائے، عوام کو ان کی سازشوں سے آگاہ کیا جائے اور ان کے دامِ تزویر سے نکالا جائے۔ اس کے ساتھ ان کے ذہن و فکر کی اصلاح کی جائے اور انھیں صحیح قیادت اور راہ نمائی فراہم کی جائے۔ مذہب کے علم برداروں کے اس جرم کو تاریخ معاف نہیں کرے گی کہ ان کے سامنے انسان مذہب کے نام پر حیوان بن جائے اور وہ خاموش تماشائی بنے رہیں۔ اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہوگی کہ مذہب کی قیادت شرپسندوں، مفسدوں اور طالع آزما افراد کے ہاتھوں میں چلی جائے اور وہ اس کی اخلاقیات کو پامال کرتے اور اس کی تصویر کو مسخ کرتے پھریں اور مذہب کے نام لیوا خاموش تماشائی بنے رہیں اور اس کا دفاع تک نہ کریں۔

اخلاقی تعلیمات مذاہب کا مشترک سرمایہ ہیں۔ جان و مال کا احترام کرنا، دل کا

بغض، حسد، نفرت، حرص، لالچ، تکبر اور شیخی جیسے امراض سے پاک ہونا، عفت و عصمت، صداقت و راست بازی، دیانت و امانت، فراخ دلی اور فراخ حوصلگی اور تواضع اور خاک ساری جیسی صفات سے آراستہ ہونا، چھوٹوں سے پیار اور محبت اور بڑوں کی تعظیم و تکریم کرنا، کم زوروں کو سہارا دینا، مسکینوں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کے کام آنا، حق داروں کے حقوق پہچاننا، ظالم کو ظلم سے روکنا اور مظلوم کی حمایت کرنا، یہ وہ اعلیٰ اخلاقی قدریں ہیں جن کے بارے میں مذاہب کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ ہر مذہب کی تعلیم کا ایک اہم حصہ ہیں، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کے بغیر مذہب کا تصور بھی مشکل سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ انسان کو انسان اور فرد اور معاشرہ کے تعلق کو خوش گوار بناتی ہیں۔ ان کے چرچے سے کسی مذہبی مجلس کو خالی نہیں ہونا چاہیے، تمام ذرائعِ ابلاغ کو اس میں لگ جانا چاہیے اور سب سے پہلے اہلِ مذاہب کو ان کا نمونہ پیش کرنا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ مذاہب کے درمیان اختلافات بھی ہیں اور ان کی ایک طویل تاریخ بھی ہے۔ کہیں توحید ہے، کہیں شرک ہے، کہیں آسمانی ہدایت کا تصوّر ہے اور کہیں یہ خیال ہے کہ ریاضت اور نفس کشی کے نتیجہ میں ہدایت انسان کے اندر سے ابھرتی ہے، کہیں آخرت ہے اور کہیں تناسخ ہے، کہیں عبادت و ریاضت کے باوجود انسان اور خدا کا فرق ہر حال میں باقی رہتا ہے اور کہیں انسان مکتی اور نجات پاکر خدا میں گم ہوجاتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہی نہیں کہ یہ اختلافات ناقابلِ حل ہیں بلکہ مذہبی نزاعات کی باعث ہیں۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ان سے تصادم اور ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مذاہب کے درمیان جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ منزل کا نہیں راستوں کا اختلاف ہے۔ منزل سب کی ایک ہے البتہ راستے جدا جدا ہیں۔ وہ اختلافات کو غیر حقیقی تصور کرتے ہیں اور انھیں وہ اہمیت نہیں دیتے جو دی جانی چاہیے۔ اس وجہ سے ان کے حل کی طرف ان کی توجہ نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مذاہب کے درمیان اختلافات ہیں اور بنیادی نوعیت کے ہیں۔ ان میں عقیدہ اور

فکر و نظر کا اختلاف بھی ہے۔ نہ تو اس سے انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے جزئی اور فروعی کہہ کر نظر انداز ہی کیا جاسکتا ہے، لیکن ان سارے اختلافات کے باوجود حقیقت تک رسائی ناممکن نہیں ہے۔ اس کے دروازے جس طرح دنیا کے کسی گروہ کے لیے بند نہیں ہیں اسی طرح اہلِ مذاہب کے لیے بھی بند نہیں ہیں، البتہ اس کے لیے تین باتوں کا اہتمام کرنا ہوگا۔

۱- ایک تو یہ کہ مذاہب کے احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے، کوئی شخص کسی مذہب کا استخفاف اور اس کی توہین نہ کرے، اس کی تعلیمات میں تحریف نہ کرے، اس کی طرف وہ باتیں نہ منسوب کرے، جن سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، اس کی محترم شخصیتوں اور بزرگوں کو برا بھلا نہ کہے اور ان کی تعلیمات کا مذاق نہ اڑائے۔ مذاہب کے درمیان جو اختلافات ہیں انھیں زبردستی ختم کرنے اور کسی ایک مذہب یا تہذیب کو بہ جبر مسلط کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ جبر و اِکراہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس سے بغاوت کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ یہ مذہب کی روح کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے کہ مذہب حقیقی خدا پرستی کا نام ہے اور کسی کو بہ جبر خدا پرست نہیں بنایا جاسکتا۔ جب خدا نے اپنی پرستش کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا ہے تو کوئی فرد دوسرے فرد کو کیسے مجبور کرسکتا ہے؟

۲- دوسرے یہ کہ عقیدہ اور عمل کی آزادی ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔ اس حق کو تسلیم کرکے اہلِ مذاہب کو اپنے اختلافات حل کرنے چاہئیں۔ کھلی فضا میں ایک دوسرے کے خیالات کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے، کسی بھی مسئلہ میں حقائق کو مسخ کرنے، واقعات کو توڑنے موڑنے کا طریقہ نہ اختیار کیا جائے، مسائل کو خلوص کے ساتھ حل کرنے کا جذبہ ہو، رد و کد اور کٹ حجتی سے بچا جائے اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں تو پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل بھی حل ہوسکتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب بات ہے اور اہل مذاہب کے

لیے باعثِ شرم کہ بڑے بڑے سیاسی اختلافات تو گفت وشنید سے حل ہوں اور مذہبی دنیا میں اس کا امکان باقی نہ رہے۔

۳- اس سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ مذہب کے بارے میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اس کا تعلق انسان کی صرف انفرادی زندگی سے ہے، اجتماعی زندگی اس سے آزاد رہے گی اور اسے آزاد رہنا چاہیے۔ اس کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ مذہب خالص شخصی اور انفرادی معاملہ ہے۔ اجتماعی زندگی کا بوجھ اٹھانے کی اس میں سکت نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مذہبی نزاعات بھی، جو اجتماعیت کے لیے سخت تباہ کن ہیں، اس راہ میں ایک رکاوٹ ہیں۔ ان نزاعات کی وجہ سے اس بات کی توقع نہیں ہے کہ مذہب لوگوں کو جوڑنے اور انھیں ایک دوسرے سے قریب کرنے کی خدمت انجام دے سکے گا۔ اس سے افتراق اور انتشار ہی پھیل سکتا ہے۔ اس غیر منطقی اور غیر فطری بات کو اہل مذاہب نے بھی عملاً تسلیم کرلیا ہے، حالاں کہ یہ مذہب کے خلاف ایک سازش ہے۔ مذہب کا رول اگر پوجا پاٹ اور پرستش تک محدود ہو اور دنیا کی صلاح و فلاح اور اس کے مسائل سے اس کا تعلق نہ ہو تو اس سے کسی کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ مذہب مخالف عناصر یہی چاہتے ہیں کہ مذہب اپنی کشش کھودے اور وہ بے جان ہوکر رہ جائے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب کا اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے، دوسری طرف مذہب کی اخلاقی تعلیمات کی ضرورت اور اہمیت کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے، حالاں کہ مذہب کا رشتہ اجتماعی زندگی سے ٹوٹنے کے بعد اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس کی اخلاقیات معاشرہ میں باقی رہیں گی۔

مذہب کی اصل، اس کے اختلافات اور زندگی سے اس کے تعلق کے بارے میں

اسلام کا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ وہ یہ کہ انسان، اللہ تعالیٰ کے دین یا اس کی ہدایت اور راہ نمائی سے کبھی محروم نہیں رہا۔ اس نے روزِ اول سے اسے دین کی دولت سے نوازا ہے۔ یہ دین بنیادی طور پر ہمیشہ ایک ہی رہا۔ وہ یہ کہ عبادت اور اطاعت صرف اللہ واحد کی ہونی چاہیے۔ اسی میں دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے، لیکن اس سے انحراف بھی ہوتا رہا۔ یہ انحراف خواہشات کی پیروی اور نفسانیت کا نتیجہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر دور میں اس کے پیغمبر آتے رہے اور اسی دین کی طرف بازگشت کی دعوت دیتے رہے۔

قرآن مجید ایک طرف تو ان تعلیمات کا خلاصہ پیش کرتا ہے جو اللہ کے پیغمبروں کے ذریعہ اس دنیا میں آتی رہی ہیں، دوسری طرف ان میں جو حذف و اضافہ اور انحراف ہوا ہے اس کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اور امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے انسان کے روحانی رشتہ کو مضبوط کرنے کے ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ انسان کس طرح پوری زندگی میں اس کی مرضی کا پابند رہ سکتا ہے؟ اس کے لیے وہ عبادات و اخلاق سے لے کر معاشرت، معیشت، قانون و سیاست اور تہذیب و تمدن غرض ہر شعبۂ حیات کے لیے ایک مربوط خاکہ پیش کرتا ہے۔ اس میں حقوق اور ذمہ داریوں کی تقسیم عدل و انصاف اور مساوات کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا آخری دین ہے اور اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ اسے کسی تعصب یا تنگ نظری کی بنیاد پر رد کر دینا صحیح نہ ہوگا۔ اس پر سنجیدہ غور وفکر کی ضرورت ہے۔

(سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، اپریل-جون ۱۹۹۳ء)

---

# کیا اسلام ہمارے مسائل حل کر سکتا ہے؟

اس وقت ملک جن نازک اور سنگین حالات سے گزر رہا ہے ان سے ہر درد مند انسان مضطرب اور پریشان ہے۔ نہیں معلوم حالات کب کیا رخ اختیار کریں گے اور ملک کہاں پہنچے گا؟ افسوس کہ ان حالات میں جس وسعتِ ذہن اور فراخیِ قلب کا ثبوت دینا چاہیے اور ہماری صفوں میں جو اتحاد اور یک جہتی ہونی چاہیے وہ مفقود ہے۔ ہم چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھے ہوئے اور ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔

قومیں بعض اجتماعی خوبیوں اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی بنیاد پر ترقی کرتی ہیں۔ جس قوم کا دامن ان خوبیوں سے خالی ہو، اس کے لیے ترقی کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں اور وہ بہت جلد زوال کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ افسوس کہ یہ اعلیٰ اقدار ہماری قومی زندگی میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی ذات اور اپنے خاندان کے مفاد کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ ملک اور قوم کے مفاد سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اپنے مفاد کی خاطر پوری قوم کو بڑے سے بڑا نقصان بے جھجک پہنچا سکتا ہے۔ اس معاملہ میں وہ لوگ بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں جو وطن پرست اور دیش بھگت ہونے کے دعوے دار ہیں اور دوسروں سے وفاداری کا ثبوت مانگتے پھرتے ہیں۔ ملک کے ذرائع و وسائل پوری قوم کی امانت ہیں لیکن ایک چھوٹا سا طبقہ ان پر قابض ہے۔ اسے اطمینان ہے کہ قانون اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ جھوٹ، مکر و فریب اور رشوت کے ذریعہ وہ اس سے بچ سکتا ہے۔ اس میں کامیابی نہ ہو تو اس کے وسیع تعلقات اس کے کام آسکتے ہیں۔

ہم نے مغرب سے جو قدریں حاصل کی ہیں ان میں سب سے نمایاں قدر

بے حیائی، عریانی اور فحاشی ہے۔ ادب، نفسیات، کلچر اور آرٹ کے نام پر اسے اس طرح فروغ دیا جا رہا ہے، جیسے ملک اور معاشرہ کی سب سے اہم ضرورت یہی ہے۔ اخبار، رسائل، کتابیں، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سنیما غرض نشر و اشاعت کے تمام ذرائع و وسائل اس پر بے تحاشا صرف ہو رہے ہیں۔ بے حیائی کے فروغ کو مغرب ترقی کی علامت سمجھتا ہے لہٰذا ہم بھی اسی فریب میں مبتلا ہیں۔ سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ وہ بھی نادان، ہم بھی نادان۔ اسی طرح دولت اور سرمایہ میں اضافہ اور عہدہ و منصب میں ترقی کے ساتھ منشیات کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبا کو اس کی لت بری طرح لگ چکی ہے۔ جس معاشرہ میں بے حیائی عام ہو، شرم و حجاب ختم ہو جائے اور منشیات کا استعمال بڑھ جائے وہ جنسی آوارگی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ زنا اور بدکاری وہاں ضرور پھیلے گی اور اس کے نتائجِ بد لازماً سامنے آئیں گے۔ مغرب کے سرمایہ دار اور امیر ملک اس عیاشی کو کسی طرح برداشت کر رہے ہیں اور ابھی کچھ عرصہ تک شاید برداشت بھی کر لے جائیں، لیکن ہندستان جیسے غریب ملک کے لیے اسے برداشت کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ وہ مرض ہے جو انسان کی قوتوں اور توانائیوں کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ افسوس کہ اس ملک کو یہ گھن لگ چکا ہے۔

کسی ملک کی سب سے بڑی طاقت اس کا اتحاد و اتفاق ہے۔ یہ نہ تو صرف خواہش اور تمنا سے حاصل ہوتا ہے اور نہ محض تقریروں اور تحریروں سے۔ اسے نہ تو زور زبردستی سے پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ وعدوں اور وعیدوں سے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پورے ملک میں اخوت اور بھائی چارے کی فضا پائی جائے، ہر ایک کے ساتھ مساوات اور برابری کا سلوک کیا جائے، ہر شخص دوسرے کے مفاد کو اپنا مفاد سمجھے، کسی کا استحصال نہ ہو، کسی پر ظلم و زیادتی نہ ہو۔ اگر کسی کی طرف سے کوئی زیادتی ہو تو قانون اس کا ہاتھ پکڑ لے اور بغیر کسی رو رعایت کے عدل و انصاف قائم کرے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ماحول کے پیدا کرنے میں ہم ناکام ہیں۔ اس ملک کے مختلف طبقات ایک دوسرے کے ساتھ عدم اعتماد کی فضا میں جی رہے ہیں۔ ہر طبقہ دوسرے کو اپنا حریف سمجھتا

ہے اور اسے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی کے اندر جوشِ انتقام ہے اور کسی کو اپنی جان بچانے کی فکر ہے۔ اتنا بڑا ملک، اس کا اقتدار اور اس کی سیاست جس تدبر اور بصیرت، جس وسعتِ ظرف اور فراخیِ قلب، جس محبت اور رواداری اور جس تہذیب اور شائستگی کا تقاضا کرتے ہیں وہ بہت کم ہمارے حصہ میں آئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آج بھی ہمارے اس ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جن کے سیرت و کردار کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا، جن کے اندر اعلیٰ اخلاقی اوصاف پائے جاتے ہیں اور جو ملک کے سچے بہی خواہ اور مخلص ہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ معاشرہ پر ان کے اثرات محسوس نہیں ہوتے۔ ان کا ذاتی کردار قومی کردار نہیں بن سکا ہے۔ جب تک پوری قوم کے اندر وہ اعلیٰ اخلاقی اوصاف نہ پائے جائیں جو اسے زندگی اور توانائی عطا کرتے ہیں، اس کی بقا اور ترقی کی ضمانت دنیا کی کوئی طاقت نہیں دے سکتی۔

اسلام کے آنے سے پہلے جزیرہ نمائے حجاز اسی طرح کے حالات سے گزر رہا تھا۔ پورا خطہ مختلف قبیلوں میں بٹا ہوا تھا، کوئی ایسا سیاسی نظام نہ تھا جو ان سب کو ایک وحدت بناتا۔ ان کا کوئی ایک لیڈر یا قائد نہ تھا جس کے احکام کے وہ پابند ہوتے بلکہ ہر قبیلہ کا اپنا سردار تھا جو اس پر حکم رانی کرتا۔ باضابطہ ملکی قوانین نہ تھے بلکہ کچھ رسوم و رواج تھے جن کی پابندی ہو رہی تھی۔ ان کے درمیان ذرا ذرا سی بات پر ہول ناک جنگیں شروع ہو جاتیں اور بعض اوقات لمبے عرصہ تک خون خرابہ کا بازار گرم رہتا۔ کسی کی جان و مال محفوظ نہ تھے۔ ظلم کی چکی پوری قوت کے ساتھ چل رہی تھی۔ طاقت ور کم زور کو کھائے جا رہا تھا، غلاموں، یتیموں، عورتوں اور بیواؤں کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ لوٹ مار، قتل و غارت گری، زنا اور بدکاری عام تھی، شراب پانی کی طرح استعمال ہو رہی تھی۔ اس طرح پورا معاشرہ ایک زبردست سیاسی اور اخلاقی بحران میں مبتلا تھا۔

اسلام نے ان سب کو اس عقیدہ کے تحت جمع کیا کہ وہ خودسر اور آزاد نہیں ہیں کہ اس دنیا میں من مانی کرتے پھریں، بلکہ وہ خدائے واحد کے بندے ہیں اور اس کی عبادت اور بندگی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے اپنا

آخری رسول بھیجا اور اپنی آخری کتاب نازل کی ہے۔ ان کی نجات اور کامیابی کی راہ صرف یہی ایک ہے کہ وہ اس کی اتباع کریں۔ اس بنیاد پر اس نے ان کے ذہن وفکر میں زبردست انقلاب برپا کر دیا، جو خدا فراموش تھے ان کا سینہ خدا کے خوف سے بھر دیا، جو بدکردار یا بے کردار تھے ان کی سیرت کو وہ نکھار عطا کیا کہ چاند تارے بھی شرمائیں، جو کسی قاعدے اور قانون کے عادی نہ تھے انھیں پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کا پابند بنایا، جن کا کوئی سیاسی نظام نہ تھا انھیں ایک مضبوط سیاسی نظام دیا، جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے انھیں بھائی بھائی بنا دیا، جو باہم برسر پیکار تھے انھیں شیر وشکر کر دیا۔ پھر ان سب کو جوڑ کر ایک ایسی امت بنائی جو خیر الامم تھی اور اس کے ذریعے پوری دنیا کی اصلاح کا کارنامۂ عظیم انجام دیا۔

اسلام نے ان متحارب گروہوں کو جوڑ کر کس طرح ایک ملت اور ایک امت بنایا اس کا ذکر قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ○ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ج وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ط كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ○

(ال عمران: ۱۰۲-۱۰۳)

اے ایمان والو، اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمھیں موت آئے تو اسلام ہی کی حالت میں آئے۔ سب اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو اور اختلاف و افتراق میں نہ پڑ جاؤ اور اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمھارے دلوں کو (محبت سے) جوڑ دیا اور اس کے فضل سے تم بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے اس سے تمھیں بچالیا۔ اس طرح اللہ تمھیں اپنی آیات کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ شاید کہ تم راہ پاؤ۔

ان آیات میں جن امور کی ہدایت کی گئی ہے، آیئے ان کا تھوڑا سا تجزیہ کیا جائے۔

اہلِ ایمان کو اتحاد و اتفاق اور اخوت کی جو دولت ملی اس کے ذکر سے پہلے انھیں تقویٰ کی، اسلام پر ثابت قدمی اور اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنے کی ہدایت کی گئی ہے، اس لیے کہ یہ دولت ان کو اسی سے ملی تھی۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ اس ہدایت پر کاربند نہ ہوں گے تو بکھر جائیں گے اور ان کی قوت پارہ پارہ ہو جائے گی۔

خطاب اہلِ ایمان سے ہے۔ ایمان یہ ہے کہ انسان اس حقیقت کو مان لے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق و مالک ہے اور اس کائنات کی تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں۔ انسان اللہ کا بندہ ہے، اس کو صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنی چاہیے۔ وہی اس کا معبود اور حاکم ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت اور بندگی اس کے لیے جائز نہیں ہے۔

اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ تقویٰ دل کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے۔ جب دل میں اللہ کے خوف کے سوا کسی کا خوف نہ ہو، جب اس کی محبت ہر دوسری محبت پر غالب آجائے، جب انسان پر اللہ کو خوش کرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے کی فکر چھا جائے اور جب انسان اللہ کے سامنے بندہ کی حیثیت سے اپنے آپ کو ڈال دے اور اس کی بندگی کے لیے بہ خوشی تیار ہو جائے تو یہ تقویٰ ہے۔

حکم ہے کہ زندگی بھر اسلام پر قائم رہو۔ اسلام اور تقویٰ دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ تقویٰ باطنی کیفیت ہے اور اسلام اس کے ظاہر کا نام ہے۔ تقویٰ اگر صحیح معنی میں دل میں موجود ہو تو وہ اسلام بن کر انسان کی زندگی میں لازماً نمایاں ہوگا۔ جس تقویٰ کا اعمال حیات میں ظہور نہ ہو وہ تقویٰ ہی نہیں ہے۔

اس کے بعد کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو، اللہ کی رسی سے مراد

اس کی کتاب قرآن مجید ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کا حاکم اور اللہ کی کتاب اس کا قانون ہے۔ ایمان، تقویٰ اور اسلام اسی کتاب سے مل سکتا ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ تمام انسان اس کتاب کو راہ نما بنائیں اور اس کے پیچھے چلیں۔ اس کے نتیجہ میں ان کو دو چیزیں ملیں گی۔ اتحاد و اتفاق اور آخرت کی کام یابی۔

اللہ تعالیٰ کو ماننے کے بعد انسان کے اندر یہ یقین ابھرتا ہے کہ تمام انسان اس کے بندے اور غلام ہیں۔ وہ ایک کنبہ کے افراد ہیں جن کو مل کر اللہ کی عبادت اور اطاعت کا فرض انجام دینا ہے۔ وہ ایک ہیں اور ایک ہی کام کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں نہ کوئی رذیل ہے نہ شریف، سب کی حیثیت ایک ہے۔ انسانوں کے درمیان زبان، رنگ اور قوم و وطن کے جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ حالات کے پیدا کردہ ہیں۔ ان کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے۔ یہ بعض ان چھوٹے چھوٹے اسباب کے نتیجہ میں وجود پذیر ہوتے ہیں جن پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ کل قیامت کے دن انسان کی قسمت کا فیصلہ ان حقیر اور غیر اختیاری اسباب کی بنیاد پر نہ ہوگا، بلکہ اس کے اعمال کی بنیاد پر ہوگا۔ وہاں سربلندی اس شخص کے لیے ہے جس کے اعمال اچھے ہیں، جو صحیح معنی میں مومن و مسلم ہے اور جس کے اندر تقویٰ پایا جاتا ہے۔ جو ان خصوصیات سے محروم ہے، اسے اللہ کے عذاب سے نہ کوئی عہدہ و منصب بچا سکتا ہے اور نہ حسب و نسب۔ اس کے لیے ذلت ہی ذلت ہے۔ یہ یقین بلندی و پستی کے تمام جھوٹے امتیازات کو ختم کر دیتا ہے اور سارے انسان اپنے اختلافات کو بھول کر ایک صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے مختلف گروہوں اور فرقوں کو صرف اسی بنیاد پر جوڑا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اتحاد کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا ملک اس کے لیے آمادہ ہوگا؟

(ماہ نامہ 'زندگی نو' نئی دہلی مئی ۱۹۹۰ء)

# مسلمانوں کی شکایتیں اور ان کا علاج

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ملک کی اقلیتوں کو، جن میں مسلمان سب سے نمایاں ہیں، یہاں کے ان برادرانِ وطن سے جو بھاری اکثریت میں ہیں، بہت سی شکایات ہیں اور ان کا اظہار بھی ہوتا رہتا ہے۔

بعض لوگ مسلمانوں کی ان شکایات اور ان کے طریقۂ اظہار میں شدت محسوس کرسکتے ہیں، بعض باتوں کو مبالغہ آمیز بھی قرار دیا جاسکتا ہے، بعض لوگوں کو ممکن ہے اس معاملہ میں مسلمانوں کے لب و لہجہ کی تلخی ناگوار گزرتی ہو، لیکن کوئی بھی انصاف پسند شخص انھیں بے بنیاد یا ناروا نہیں کہہ سکتا۔

مسلمان سمجھتے ہیں کہ ان کے خلاف شدید تعصب کی فضا ہر طرف چھائی ہوئی ہے اور وہ اس فضا میں سانس لینے پر مجبور ہیں۔ اس تعصب کا مظاہرہ کبھی کسی فرد کی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی کسی گروہ کی طرف سے۔ نہ تو سیاسی پارٹیوں کا دامن اس سے بالکل پاک ہے اور نہ سماجی تنظیموں کا۔ انتظامیہ بھی اس کی شکار ہے اور حکومت بھی۔ اس تعصب کی کوئی ایک شکل نہیں ہے، بلکہ اس کا ظہور بہت سی شکلوں میں ہوتا رہتا ہے۔

مسلمان اس ملک میں اپنی انفرادیت کے ساتھ جینا چاہتے ہیں۔ ان کی یہی خواہش یہاں کے بہت سے افراد اور تنظیموں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مسلمانوں کی انفرادیت اور ان کے تشخص کا باقی رہنا ان کے لیے بلکہ پورے ملک کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے اور اس خطرہ کا وہ ہر قیمت پر مقابلہ

کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے کبھی قومی دھارے میں ضم ہونے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، کبھی پرسنل لا میں ترمیم کی نصیحت کی جاتی اور یکساں سول کوڈ پر زور دیا جاتا ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنی قدیم روایات کو چھوڑ کر زمانہ کا ساتھ دیں ورنہ وہ پستی اور نکبت و افلاس سے نہیں نکل سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمان ترقی کرنا چاہیں تو اپنی تہذیب اور اقدارِ حیات سے دست بردار ہوجائیں اور جس طرح دوسری قومیں آنکھیں بند کر کے زمانہ کے پیچھے دوڑ رہی ہیں وہ بھی اس میں شریک ہوجائیں۔ یہی تعصب اور تنگ نظری ہے جو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ مسلمانوں کی صدیوں پرانی عبادت گاہیں اور مقدس مقامات اپنے حال پر باقی رہیں، ان پر قبضے اور تصرف کے لیے بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں اور اس میں کام یابی بھی ہوتی رہتی ہے۔

اس تعصب اور تنگ نظری کی وجہ سے مسلمان ملکی زندگی میں اس تعاون اور ہم دردی سے محروم ہیں جو انھیں یہاں کے شہری ہونے کی حیثیت سے ملنا چاہیے اور جو کسی بھی فرد اور جماعت کی مادی اور معاشی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ یہی نہیں کہ انھیں تعاون نہیں مل رہا ہے بلکہ ان کی صلاحیتوں کا اعتراف تک نہیں کیا جاتا۔ جو صلاحیتیں ملک وقوم کے کام آسکتی ہیں، وہ رائیگاں جاتی ہیں، ان کی خدمات کی قدر نہیں کی جاتی جس کی وجہ سے امنگوں پر اوس پڑ جاتی ہے اور حوصلے دم توڑنے لگتے ہیں۔ ان کی وفاداری کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور انھیں دوسرے ملکوں کا ایجنٹ قرار دینے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ صورتِ حال کچھ ایسی بنتی جا رہی ہے جیسے مسلمان ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں اور یکے بعد دیگرے ان پر الزامات کی بوچھاڑ ہو رہی ہو۔ ان کا سب سے بڑا کام ان الزامات کی صفائی پیش کرنا ہے۔ جب کسی گروہ کو مجرم قرار دے کر اسے صفائی پیش کرنے میں لگا دیا جائے تو وہ اپنی یا ملک کی بھلائی کے لیے کیا سوچے گی اور کیا کرے گی؟

اس تعصب اور تنگ نظری کے ساتھ عملاً سیاسی قوت اور اقتدار بھی جمع ہوگیا ہے۔

(ویسے از روئے دستور مسلمان بھی اقتدار میں شریک ہیں) اس لیے اس کے اثرات بڑے وسیع اور دور رس ہیں اور زندگی کے تمام اجتماعی شعبوں میں محسوس ہوتے ہیں۔

تعلیم کے میدان میں جن اداروں کا انتظام اکثریت کے ہاتھوں میں ہے، ان میں مسلمانوں کا داخلہ مشکل ہے۔ اس لیے مسلمان زیادہ تر اپنے ہی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔ تعلیم کے بعد ملازمت میں دشواری پیش آتی ہے۔ ان کے مقابلہ میں اکثریت کو ترجیح دی جاتی ہے، اس لیے مسلمانوں میں روز بروز تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

بعض اوقات اس کی وجہ مسلمانوں کی عدم صلاحیت یا نااہلی بتائی جاتی ہے۔ حالاں کہ یہ ایک لغو بات ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہ بات اس وقت ثابت ہوسکتی ہے جب کہ تعلیم کے میدان میں مسلمانوں اور برادرانِ وطن کو برابر کی سہولتیں اور مواقع حاصل ہوں۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمان بچے اپنے جن اداروں میں تعلیم پا رہے ہیں ان میں بالعموم وہ سہولتیں مفقود ہوتی ہیں جو اکثریت کے اداروں میں پائی جاتی ہیں، اس لیے فطری طور پر ان کا معیار کم ہوتا ہے۔ ان کے معیار کو بلند کرنے کی راہ میں بعض وہ رکاوٹیں ہیں جنھیں حکومت کے تعاون ہی سے دور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حکومت کی نظرِ عنایت اکثریت ہی کی طرف رہتی ہے۔

معاشی میدان مسلمانوں کے لیے تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ آج ہندستان اپنی انڈسٹری میں تیزی سے ترقی کر رہا ہے، چھوٹی بڑی بے شمار صنعتیں قائم ہو رہی ہیں، زراعت اور دوسرے غذائی شعبوں میں بڑے بڑے فارم وجود میں آتے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ حکومت کی سرپرستی یا اس کی فراہم کردہ سہولتوں کی بنیاد پر ہو رہا ہے۔ اس میں مسلمانوں کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہے۔ زیادہ تر ان کی حیثیت مزدور اور کاریگر طبقہ (Labour Class) کی ہے۔ جو بڑے تاجروں اور صنعت کاروں کی دولت بڑھا رہا ہے۔ اسی طرح درآمد و برآمد (Export & Import) میں ان کا حصہ برائے نام ہے۔

سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا اوسط آزادی کے بعد گرتا چلا گیا ہے۔ بعض

اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے جیسے ان کے لیے بند ہوگئے ہوں، انتظامیہ سے وہ عملاً بے دخل سے ہوکر رہ گئے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دیدہ و دانستہ وہ انتظامیہ سے دور رکھے جارہے ہیں۔

ملک کے موجودہ جمہوری نظام کے تحت پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے ان کے نمائندے نہیں پہنچ پاتے۔ ملک کو کچھ اس طرح انتخابی حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے کہ محض مسلمانوں کے ووٹ کی بنیاد پر ان کا کامیاب ہونا ممکن نہیں ہے ـــ اس سے وہ معدودے چند حلقے مستثنیٰ ہیں جہاں اس طرح کی تقسیم ممکن نہیں ہے ـــ غیر مسلم حلقوں سے وہی مسلمان امیدوار کامیاب ہوسکتا ہے جسے سیکولر پارٹیوں نے کھڑا کیا ہو اور سیکولر پارٹیوں کا مطلب اس وقت اکثریت کی ترجمانی کرنے والی پارٹیاں ہیں۔ ان پارٹیوں کے ٹکٹ پر جو مسلمان کامیاب ہوتے ہیں انھیں پارٹی کی قیادت اور ہائی کمان کے سامنے اپنی وفاداری کا ثبوت فراہم کرنے ہی سے فرصت نہیں ملتی، وہ بے چارے مسلمانوں کی فکر کہاں سے کر پائیں گے؟

ان حالات اور اس فضا میں مسلمان اگر اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کریں، اپنے دفاع کی جدوجہد کریں اور حق تلفی و زیادتی کے سدِّ باب کے لیے دوڑ دھوپ کریں تو ان پر فرقہ پرستی اور قوم دشمنی کا لیبل لگ جاتا ہے۔ اس طرح کی ہر جدوجہد کو قومی دھارے سے مسلمانوں کو الگ رکھنے کی کوشش سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ کسی کا اپنے فرقہ کی فلاح و بہبود اور اس کے دفاع کی کوشش کرنا فرقہ پرستی ہرگز نہیں ہے۔ فرقہ پرستی نام ہے اپنے فرقہ کے فائدے کے لیے دوسرے فرقوں کو نقصان پہنچانے کا۔ خدا کا شکر ہے مسلمانوں کا دامن اس سے پاک ہے۔

بعض لوگ بڑی آسانی سے خود مسلمانوں کو اس صورتِ حال کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی جہالت، غفلت اور کوتاہی، محنت سے جی چرانا، دورِ جدید کے تقاضوں سے بے خبری اور طاقت ور حریف سے مقابلہ کا جذبہ ان کی موجودہ

زبوں حالی اور پس ماندگی کا سبب ہیں۔ وہ اپنی پستی کے اسباب تلاش کرنے کی جگہ یہ دیکھ دیکھ کر کڑھتے ہیں کہ دوسرے ترقی کر رہے ہیں۔ انھیں اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے سے زیادہ دوسروں کو اپنی راہ کی رکاوٹ ثابت کرنے سے دل چسپی ہے۔ وہ اکثریت کے جس تعصب اور تنگ نظری کا چرچا کرتے ہیں خود اس سے ان کا دامن پاک نہیں ہے۔

یہ تجزیہ صحیح ہے یا غلط اس سے قطع نظر اس کا اصل مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں دو الگ سوال ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں میں غفلت اور کوتاہی ہے یا نہیں؟ غالباً اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ وہ غفلت کا شکار ہیں۔ اسے دور ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ کی ہر کوشش مبارک کوشش ہے۔ لیکن اس وقت ایک دوسرا ہی سوال زیر بحث ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتا جا رہا ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کا کیا علاج ہے؟ کیا مسلمانوں کی محنت اور جفاکشی سے یہ تعصب دور ہوجائے گا اور مسلمانوں کے ساتھ انصاف ہونے لگے گا؟ تعصب نام ہے اس بات کا کہ کوئی شخص آپ کی ترقی کو دیکھنا نہ چاہے اور آپ کے زوال کا خواہش مند ہو۔ اس جذبہ کے ہوتے ہوئے کیا اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کی محنت کی قدر کی جائے گی اور ان کے لیے ترقی کی راہیں کھل جائیں گی؟ کیا اس وقت عملاً قابل مسلمانوں کی پذیرائی ہو رہی ہے؟ اس کے علاوہ مسلمانوں کی غفلت اور کوتاہی اس بات کا جواز نہیں فراہم کرتی کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو اور انھیں ان کے جائز حقوق سے محروم کر دیا جائے۔

مسلمانوں کی سیاسی جماعتیں اس مسئلہ کو سیاسی طور پر حل کرنا چاہتی ہیں۔ اس کے کسی متعین حل پر ان کا اتفاق نہیں ہے، البتہ مختلف تجویزیں سامنے آتی رہتی ہیں اور بعض پر عمل درآمد کی کوشش بھی ہوتی ہے۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ دستورِ ہند میں اقلیتوں کو جو حقوق حاصل ہیں ان میں اس طرح ترمیم اور اضافہ ہونا چاہیے کہ اس وقت جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ان کا سدِّباب ہوسکے۔ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں ان کی آبادی کے لحاظ سے ان کی نشستیں

متعین ہوں، ان کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کو اور آزادی ملے، ان کو زیادہ سہولتیں حاصل ہوں، جن تعلیمی اداروں کو حکومت چلاتی ہے ان میں ان کی مناسب تعداد کو جگہ دی جائے، ملازمتوں میں آبادی کے لحاظ سے ان کا حصہ مقرر ہو، فرقہ وارانہ فسادات میں ان کے نقصانات کی تلافی اور ان کے مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے قوانین وضع کیے جائیں۔ وغیرہ۔

یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ موجودہ دستور میں بھی اقلیتوں کو اکثریت سے کم حقوق حاصل نہیں ہیں، لیکن اقلیتوں کو شکایت یہ ہے کہ یہ حقوق عملاً انھیں مل نہیں رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب دستور میں موجود حقوق نہیں مل رہے ہیں تو ان میں کچھ اور حقوق کا اضافہ ہونے کے بعد کیا وہ سب حقوق ملنے لگیں گے۔ دس حقوق کی راہ میں جو تعصب حائل ہے کیا ان کی تعداد پندرہ ہونے سے وہ ختم ہوجائے گا یا اس میں کمی آجائے گی؟ زیادہ اندیشہ اس کا ہے کہ اس میں اور اضافہ ہوگا۔

ایک خیال یہ ہے کہ ساری خرابی حکومتِ وقت کی ہے۔ وہ اگر مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہے تو کرسکتی ہے۔ اس کی راہ میں کوئی بڑی رکاوٹ نہیں ہے۔ مسلمانوں نے اس معاملہ میں اب تک برسرِ اقتدار پارٹی سے توقعات وابستہ رکھیں اور آزادی کے بعد ہر موقع پر اس کا ساتھ دیا لیکن تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ اس پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔ جمہوریت میں الیکشن ایک بڑی طاقت ہے۔ اس طاقت کو مسلمان استعمال کریں اور حکومت کو بدل دیں۔

اتنی بات واضح ہے کہ موجودہ جمہوری ڈھانچہ میں، مسلمان تنہا اپنے ووٹ کے ذریعہ حکومت بنا سکتے ہیں اور نہ کسی حکومت کو بدل سکتے ہیں۔ اس کے لیے انھیں کسی دوسری پارٹی کا ساتھ دینا ہوگا۔ وہ پارٹی وہی ہوسکتی ہے جو یہ وعدہ کرے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور ان کے حقوق کا تحفظ کرے گی، لیکن افسوس کہ کوئی بھی پارٹی اس قسم کا وعدہ کرنے یا مسلمانوں کے مطالبات کو اپنے الیکشنی مینی فیسٹو میں شامل کرنے

کے لیے تیار نہیں ہے۔ موجودہ حالات میں اس کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ ہوسکتا ہے کہ برسراقتدار پارٹی میں اور جو پارٹیاں اقتدار میں نہیں ہیں ان میں کچھ ایسے کھلے اور صاف ذہن کے افراد ہوں جو مسلمانوں سے ہم دردی رکھتے ہوں اور یہ چاہتے ہوں کہ ان کے مسائل حل ہوں۔ آپ ان سے جتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اٹھالیں، لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ وہ پارٹی کی عمومی پالیسی کے خلاف نہیں جاسکتے۔ ورنہ وہ پارٹی کے لیے ناقابلِ برداشت ہوجائیں گے۔ پھر انھیں اس بات کا بھی ڈر ہے کہ مسلمانوں کی پرجوش حمایت کے بعد وہ اکثریت کے ووٹ سے محروم ہوجائیں گے۔ آج کی ساری سیاست ووٹ ہی کے گرد گھومتی ہے۔ اس نقصان کو برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ یا وسعتِ ظرف کسی میں نہیں ہے۔

اس موقع پر ایک اور بات کہی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ یہاں شیڈول کاسٹ یا پست اقوام بھی اکثریت کی زخم خوردہ ہیں۔ وہ ان کے اقتدار کو سخت ناپسند کرتی ہیں اور ان کے خلاف ان کے اندر شدید جذبات پائے جاتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کا ان کے ساتھ اتحاد ہوجائے تو آبادی میں ان کا تناسب بڑھ جائے گا، بلکہ ہوسکتا ہے کہ تناسب ان کے حق میں ہوجائے۔ مختلف گروپس جو اپنی جگہ بے اثر ہیں وہ باہم مل کر ایک زبردست طاقت بن سکتے ہیں اور یہاں کی سیاست کا رخ بدل سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہاں کی شیڈول کاسٹ اقوام کو اپنی مظلومیت کا احساس ضرور ہے اور وہ اس کے لیے سخت کوشش بھی کر رہی ہیں، لیکن آپ کے دکھ درد کا انھیں احساس نہیں ہے۔ انھیں آپ کے مسائل کے حل کی فکر نہیں بلکہ اپنے مسائل کے حل کی فکر ہے۔ وہ آپ کے تعاون سے اپنے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں۔

شیڈول کاسٹ طبقات، جن کے ساتھ آپ اتحاد چاہتے ہیں، ان کی قیادت آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ خود ان کے ہاتھ میں ہے اور وہ آپ کو بھی اپنی قیادت میں لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کی قیادت ان کے اپنے کچھ مسئلے حل کرلے،

سوال یہ ہے کہ آپ کے مسائل سے بھی اسے اتنی دل چسپی ہوگی جتنی اپنے مسائل سے ہے اور وہ ان کو اتنی اہمیت دے گی جتنی اہمیت اپنے مسائل کو دیتی ہے اور انھیں حل کرنے کی سعی و جہد کرتی ہے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ جب دو گروہوں میں اتحاد ہوتا ہے تو جو گروہ قائدانہ رول ادا کرتا ہے اور جو سیاسی لحاظ سے مضبوط ہوتا ہے وہی فائدہ میں رہتا ہے۔ حالات اس کے حق میں ہوجائیں تو وہ حلیف گروہ کو نظر انداز بھی کرسکتا ہے۔ بالعموم نظر انداز کر ہی دیتا ہے۔ اس کا تجربہ آزادی کی تحریک کے سلسلہ میں مسلمانوں کو ہو چکا ہے۔ انھوں نے اقلیت میں ہونے کے باوجود ملک کی آزادی کے لیے کانگریس سے کم قربانیاں نہیں دیں، لیکن اقتدار میں آنے کے بعد کانگریس نے جو اکثریت کی نمایندگی کرتی تھی مسلمانوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا اس سے پوری دنیا واقف ہے۔ آج جن مسائل اور مشکلات کی مسلمان شکایت کرتے ہیں وہ سب یا ان میں سے بیشتر اسی کے دور کی پیداوار ہیں۔

شیڈول کاسٹ اقوام کے بارے میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے سامنے ملک اور مختلف طبقات کی فلاح و بہبود کا کوئی منصوبہ یا پروگرام نہیں ہے۔ وہ صرف برہمنیت کے خلاف ایک ردِ عمل کے طور پر ابھری ہیں۔ چوں کہ حکومت کو بھی وہ برہمن حکومت سمجھتی ہیں اس لیے اس کے خلاف ہیں۔ اس ردِ عمل میں وہ کامیاب ہوجائیں تو اندیشہ ہے کہ وہ بھی ظلم کا وہی رویہ نہ اختیار کریں جس کا الزام وہ برسرِ اقتدار طبقہ کو دے رہی ہیں۔ اس لیے کہ ردِ عمل کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ کسی حد پر نہیں رکتا۔ وہ تمام حدود کو توڑ کر آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ یہ صورتِ حال پورے ملک کے لیے تباہ کن ہے۔ اس میں ان کا ساتھ کسی طرح نہیں دیا جاسکتا۔ یہ چیز ایک اور کشمکش کی بنیاد بن سکتی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان کسی جماعت سے کوئی سیاسی معاہدہ نہ کریں یا کسی پارٹی کی نہ حمایت کریں اور نہ اس کی حمایت حاصل کریں۔ ایک جمہوری ملک میں

اس طرح کی بے تعلقی کچھ اور پیچیدگیاں پیدا کرسکتی ہے۔ ظاہر ہے سب ہی پارٹیاں ایک طرح کی نہیں ہیں۔ مسلمان کسی ایسی پارٹی کی حمایت نہیں کرسکتے جو ان کے دین و مذہب اور تہذیب و ثقافت کو ختم کرنا چاہتی ہو اور جس کے اقتدار میں آنے سے ان کے دستوری اور بنیادی حقوق ہی خطرہ میں پڑ سکتے ہوں۔ ان کی حمایت کسی ایسی ہی پارٹی کو حاصل ہوگی جو ان کے مسائل اور پریشانیوں کو سمجھتی ہو، جو ان سے نسبتاً ہمدردی کا معاملہ کرے اور جس سے اس بات کی توقع کی جاسکے کہ وہ دستور کی پابند رہے گی۔ لیکن اس سے ہمارا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دو کام کرنے ہوں گے۔

ایک یہ کہ پورے ملک میں ایسی فضا پیدا کی جائے کہ ہر انسان کے بنیادی اور فطری حقوق کا احترام ہو اور ہر فرد کو عملاً وہ حاصل ہوں۔ ایک شخص کا تعلق کسی بھی طبقہ سے ہو، اس کے بنیادی حق پامال نہ ہونے پائیں، جمہوریت کے فوائد کسی خاص گروہ تک محدود ہوکر نہ رہ جائیں، بلکہ سب ہی طبقات کو اس کا فائدہ پہنچے۔ ملک کے ہر فرد کی جان، مال اور عزت و آبرو محفوظ رہے اور اسے عقیدہ و خیال اور عمل کی آزادی حاصل ہو، قانون کی حکم رانی ہو اور سب کو انصاف ملے اور آسانی سے ملے، کم زوروں کا معاشی، سیاسی اور تہذیبی استحصال ختم ہو اور ترقی کے مواقع انھیں حاصل ہوں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو دوسروں کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھنے کی جگہ آگے بڑھ کر قائدانہ کردار ادا کرنا ہوگا۔ اس میں انھیں ان طبقات کا تعاون آسانی سے حاصل ہوسکتا ہے جو اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور جو کم و بیش ان ہی مسائل سے دو چار ہیں جن میں مسلمان گھرے ہوئے ہیں۔ ملک میں جب اس طرح کی فضا ہوگی تو سیاسی پارٹیاں بھی اس کی روشنی میں اپنا لائحۂ عمل مرتب کرنے پر مجبور ہوں گی اور اس کے خلاف قدم اٹھانا آسان نہ ہوگا۔

اس سے آگے جو کام مسلمانوں کے کرنے کا ہے اور جسے صرف وہی کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس ملک میں اسلام کے علم بردار اور ترجمان بن کر اٹھیں اور جو نسخۂ شفا وہ تجویز کرتا ہے اسے پورے اعتماد کے ساتھ پیش کریں۔

اب تک مسلمانوں کی ساری کوششوں کا رخ یہ رہا ہے کہ ملک کے موجودہ ڈھانچہ میں وہ بحیثیت ایک قوم کے زندہ رہیں اور مادی لحاظ سے بہتر مقام انھیں حاصل ہو۔ اس میں شعوری طور پر نہ تو یہ ایمان و یقین شامل ہے کہ اسلام ان کے اور ملک کے مسائل حل کرسکتا ہے اور نہ اس کے مطابق کوئی حکمتِ عملی ہی مرتب کی گئی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کا برملا اظہار ہونا چاہیے کہ اسلام تعصّبات کی دیواروں کو منہدم کرتا، کم زور پر سے طاقت ور کے غلبہ کو ختم کرتا اور اس کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی کے ذریعہ ظلم و زیادتی کا خاتمہ اور عدل و انصاف کا قیام ممکن ہے۔ مسئلہ صرف اس دنیا ہی کا نہیں، آنے والی دنیا کا بھی ہے۔ اسلام دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔ اسلام انسان کی فطری طلب اور اس کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کے بغیر کسی ملک، کسی طبقہ اور کسی فرد کے مسائل حل نہیں ہوسکتے۔ امت مسلمہ کا فرض ہے کہ وہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کھڑی ہوجائے۔ اسی سے بالآخر اس کے مسائل بھی حل ہوں گے اور دنیا کے مسائل بھی۔ کیا وہ اس کے لیے تیار ہے؟

(ماہ نامہ 'زندگی نو' نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۸۸ء)

---

# ان حالات میں ہم کیا کریں؟

ملک میں تازہ پارلیمانی انتخابات [۱۹۸۹] مکمل ہوگئے اور نئی حکومت قائم ہوگئی۔ انتخابات میں ہنگاموں اور تشدد کے مظاہروں سے ہمارا ملک نامانوس نہیں ہے۔ یہ سب کچھ یہاں ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن اب کی بار پورا الیکشن ہی ہنگاموں اور تشدد کے زیرِ سایہ ہوا۔ جعلی ووٹ کا استعمال اس کثرت سے ہوا کہ پچھلا ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ الیکشن کمشنر نے بیشتر شکایات کو صحیح تسلیم کیا اور ایک ہزار سے زائد مقامات پر دوبارہ پولنگ ہوئی۔ ان حلقوں میں بھی بے ضابطگی اور دھاندلی ہوئی جن میں بڑی بڑی سیاسی شخصیتیں اور مختلف پارٹیوں کے ذمہ دار کھڑے تھے۔ یہ اخلاقی پستی کی آخری حد ہے۔ ان میں سے کسی نے اس پر ندامت کا اظہار نہیں کیا۔ حتیٰ کہ کسی کو اس کے اعتراف کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ جو لوگ عوام کے نمائندے بن کر سامنے آتے ہیں ان کے اخلاق و کردار کا یہ عالم ہو تو عوام سے اخلاقی بلندی کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟

ملکی انتخابات میں ہمیشہ کانگریس کامیاب ہوتی رہی ہے، اس سے صرف ۱۹۷۷ء کا الیکشن مستثنیٰ ہے، جس میں ایمرجنسی کے نفاذ اور اس دوران میں ہونے والے سیاہ کارناموں کی وجہ سے اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کانگریس کی اس مسلسل کامیابی میں مسلمانوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اس کی تمام کمزوریوں کے باوجود انھوں نے اسی کو غنیمت جانا اور اسی کو تختِ حکومت پر پہنچانے کی کوشش کی۔

موجودہ الیکشن کے دوران میں شمالی ہند فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں جلتا رہا۔ اس آگ کو بجھانے میں کانگریس نے جس غفلت کا ثبوت دیا اور جس طرح جانب داری سے کام لیا مسلمانوں کو اس سے مایوسی ہوئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی جان، مال، عزت و آبرو اور مذہبی آزادی کے سلسلہ میں اس پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ انھیں مخالف کیمپ کو آزمانا چاہیے۔ انھوں نے موجودہ حکومت کے حق میں اس توقع کے ساتھ ووٹ دیا ہے کہ وہ کانگریس کی طرح ان سے بے توجہی نہیں برتے گی، ان کے جائز حقوق کی حفاظت کرے گی، ان کے مسائل کو سمجھے گی اور انھیں عدل و انصاف کے مطابق حل کرے گی، دیکھنا یہ ہے کہ ان کی توقعات کس حد تک پوری ہوتی ہیں۔

اس وقت مسلمان جن سنگین حالات سے گزر رہے ہیں وہ نئے نہیں ہیں۔ ان کا ایک طویل پس منظر ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ قوموں پر نازک سے نازک حالات آتے ہیں اور اسی میں ان کا امتحان ہوتا ہے۔ جو قومیں قوتِ حیات سے محروم ہوتی ہیں وہ مخالف حالات کے سامنے سپر ڈال دیتی ہیں، ان پر مایوسی طاری ہوجاتی ہے، ان کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے اور انھیں ہر طرف موت کے بھیانک سایے نظر آنے لگتے ہیں۔ ان کے پاس جو کچھ قوتِ حیات ہوتی ہے وہ بھی مایوسی، گھبراہٹ اور بے چینی کی نذر ہوجاتی ہے۔ وہ زبانِ حال سے اعلان کر دیتی ہے کہ اس کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ وہ مٹنا چاہتی ہے اور مٹ رہی ہے، جو قوم اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار ہوجائے اسے اکھاڑ پھینکنے میں دیر نہیں لگتی۔ حالات کا ایک ہی ریلا اسے خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔

زندہ قوموں کا حال دوسرا ہوتا ہے، ناسازگار اور مخالف حالات ان کی قوت میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔ وہ ہمت نہیں ہارتیں، بزدلی اور پست ہمتی نہیں دکھاتیں، ان پر مایوسی نہیں طاری ہوتی۔ وہ اس اعتماد اور حوصلہ کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں کہ حالات کے سامنے سپر انداز نہیں ہوں گی، بلکہ انھیں سازگار بنانے اور اپنے حق میں موڑنے کی

کوشش کریں گی۔ جس قوم میں یہ عزم و حوصلہ ہو دنیا کی کوئی طاقت اسے مٹا نہیں سکتی۔ اسلام اپنے ماننے والوں میں یہی عزم و حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اس کی پوری تاریخ عزم و حوصلہ کی تاریخ ہے۔ اگر اسلام کے ماننے والے اپنا عزم و حوصلہ کھو بیٹھیں اور حالات کے سامنے سرنگوں ہو جائیں تو اپنے دین کو رسوا اور اپنی تاریخ کے تاب ناک اوراق میں ایک سیاہ باب کا اضافہ کریں گے۔

زندگی میں ہر قدم پر صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مخالف حالات میں تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ یہاں کام یابی اس کو ملتی ہے جو نازک سے نازک موقع پر بھی صبر کا دامن نہ چھوڑے، جذبات میں مشتعل اور بے قابو نہ ہو، ہوش و حواس نہ کھو بیٹھے اور کوئی ایسی حرکت نہ کر گزرے جو اس کے لیے بھی اور اس ملت کے لیے بھی جس سے وہ وابستہ ہے، نقصان کا باعث ہو۔ بہت سی مشکلات اس وجہ سے بھی پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی غصہ اور جھنجلاہٹ میں ایسے اقدامات کر گزرتا ہے جو اسے نہیں کرنے چاہئیں۔ صبر یہ ہے کہ آدمی صحیح موقف پر جما رہے اور جس وقت جو قدم اٹھانا چاہیے وہی اٹھائے، صبر کی اسلام نے جس قدر تاکید کی ہے اسی قدر ہماری سیرت اس سے خالی ہے۔ بے صبری، جلد بازی اور اشتعال پسندی کا مظاہرہ کر کے ہم صبر و ثبات کا صلہ چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ناممکن ہے۔

صبر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جذبات ہی سرد پڑ جائیں اور پوری قوم بزدلی، دوں ہمتی اور بے حسی کا شکار ہو جائے۔ اس کی موت و حیات کے فیصلے ہو رہے ہوں اور بڑے بڑے حادثات اس کے سر سے گزر جائیں اور وہ مہر بہ لب خاموش تماشائی بنی رہے۔ جب کوئی قوم اپنے حقوق سے خاموشی کے ساتھ دست بردار ہوتی چلی جائے اور ظلم و زیادتی پر کسی ردِ عمل کا مظاہرہ نہ کرے تو یہ اس کے ضعف اور بے چارگی کی کھلی علامت ہے اور اس دنیا میں: ع

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

لیکن یہ بات نہیں فراموش کرنی چاہیے کہ جذبات کے ساتھ حکمت و دانائی بھی ضروری

ہے۔ حالات سے باخبر رہنا، مفسدوں اور فتنہ پردازوں کے منصوبوں سے واقف ہونا اور انھیں ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کرنا ضروری ہے۔ اس ملک کی بہت بڑی اکثریت فتنہ و فساد کو ناپسند کرتی ہے، لیکن اس کی کم زوری یہ ہے کہ وہ فسادیوں کے سامنے آنے کی ہمت نہیں کرتی، ان کے اندر جرأت و ہمت پیدا کرنی ہوگی۔ آپ کو ایسے افراد بھی ملیں گے، جو ظلم و ناانصافی کو ختم کرنے میں آپ کا ساتھ دیں گے۔ آپ کو ان سب کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ حکومت کی ذمے داری ہے کہ ملک کے ایک ایک شہری کی جان و مال اور اس کے آئینی حقوق کی حفاظت کرے، اس کی یہ ذمے داری اسے یاد دلانی ہوگی، اس کی غفلت پر تنقید کرنی ہوگی اور ایسے تمام جائز طریقے اختیار کرنے ہوں گے کہ وہ آپ کو نظر انداز نہ کرے اور آپ کا وزن محسوس کرے۔ اس طرح آپ حالات کو ٹھیک رکھنے میں مدد کرسکتے ہیں۔

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ظلم کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ وہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ ظلم کو سخت ناپسند کرتا ہے، لیکن اس کی سنت یہ ہے کہ وہ ظالم کو ایک خاص وقت تک مہلت دیتا ہے۔ اگر وہ ظلم سے باز نہ آئے اور اپنی روش نہ بدلے تو اسے اس طرح پکڑتا ہے کہ پھر کوئی جائے پناہ اس کے لیے باقی نہیں رہتی۔ بڑی بڑی ظالم قومیں خدا کے اس غضب کا نشانہ بن چکی ہیں۔ اس ملک کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ظلم و زیادتی اور فتنہ و فساد سے اسے پاک کیا جائے، ورنہ یہ ملک ڈوبے گا اور ہم سب اس کے ساتھ ڈوب جائیں گے۔ لیکن ظلم کو وہی ختم کرسکتا ہے، جس کا دامن ہر طرح کے ظلم سے پاک ہو، جو کسی پر زیادتی نہ کرے، جو کسی کی جان، مال اور عزت و آبرو پر دست درازی نہ کرے، جس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ کسی کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کرے گا، جس پر لوگ اعتماد کریں، جو مصیبت کے وقت ڈھال بن جائے، جو ظالم کا ہاتھ پکڑے اور مظلوم کی حمایت کرے۔ مسلمان کی یہی حیثیت ہے اور اپنی اس حیثیت کو اسے باقی رکھنا چاہیے۔

اس سلسلہ میں آخری بات یہ عرض کرنی ہے کہ مسلمانوں کے مسائل ان کے اتحاد و اتفاق اور مشترکہ کوشش ہی سے حل ہوسکتے ہیں۔ حالات اس قدر پیچیدہ اور مسائل اتنے سخت ہیں کہ کسی ایک فرد یا جماعت کے بس میں نہیں ہے کہ وہ انھیں حل کردے۔ مسائل سب کے ہیں اور سب ہی کو مل جل کر حل کرنے ہوں گے۔ اس کے لیے انھیں اپنے چھوٹے چھوٹے اور جزوی اختلافات کو بھول کر ایک پلیٹ فارم پر آنا ہوگا۔ اگر امت بکھری ہوئی ہو تو اس کی آواز کم زور ہوگی۔ کم زور آواز شور و شغب اور ہنگاموں کے اس دور میں ہرگز سنی نہیں جاتی۔ ع

نوا را تیز تر می زن چوں ذوق نغمہ کم یابی

اس امت کا اتحاد اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کی بنیاد پر ہوا تھا اور اسے بتا دیا گیا تھا کہ اس کی طاقت اسی اتحاد میں پوشیدہ ہے۔ اختلاف و انتشار اسے کم زور کردے گا اور کارزارِ حیات میں اس کے قدم اکھڑ جائیں گے۔

وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَاصْبِرُوْاؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۝ (الانفال:۴۶)

اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمھارے اندر کم زوری پیدا ہوجائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

افسوس کہ ہم نے قرآن کی اس نصیحت کو فراموش کر دیا۔ اب اس کا علاج یہی ہے کہ پوری امت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف پلٹ آئے اور اپنی صفوں کو درست کرلے۔ اس کے درد کا درماں اس سے پہلے نہ کوئی اور تھا اور نہ اب ہے۔

(ماہ نامہ 'زندگی نو' نئی دہلی، دسمبر ۱۹۸۹ء)

# کچھ ہمارے سوچنے کی باتیں

۶/ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد شہید کردی گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے بیان کرنے کے لیے الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ ملک کے مختلف علاقوں میں آگ سی لگ گئی، ہول ناک فسادات کا طویل سلسلہ شروع ہوگیا، قتل وخوں ریزی کا بازار گرم ہوا، غلط کاروں اور مفسدوں کے ساتھ سیکڑوں بے گناہ جانیں ضائع ہوئیں، ہزاروں افراد زخمی ہوئے، عصمتیں لٹیں، مکانات جلے، دکانیں نذرِ آتش ہوئیں، کاروبار تباہ ہوئے، اربوں اور کھربوں کا مالی نقصان ہوا، لوگ گھروں سے بے گھر ہوگئے، عبادت گاہوں تک کی حرمت پامال ہوئی اور وہ تباہ ہوئیں۔

فسادات کی ہول ناکی اور جان و مال کی تباہی کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کو ۱۹۴۷ء یاد آگیا، کسی نے اسے ملک کی حالیہ تاریخ کا سیاہ باب قرار دیا، کسی نے کہا کہ گاندھی جی کے قتل کے بعد یہ سب سے بڑا قومی حادثہ ہے۔ گاندھی جی ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے، انھیں قتل کرکے اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، بابری مسجد کو شہید کرنے والوں کا بھی یہی مقصد ہے۔ دونوں کے پیچھے ایک ہی ذہن کام کررہا ہے۔

اس خوف ناک صورتِ حال نے سوچنے سمجھنے والوں کو ہلاکر رکھ دیا اور ذہنوں میں طرح طرح کے سوالات ابھرنے لگے۔ کیا ہمارے ملک میں واقعی قانون کی حکم رانی ہے یا کوئی گروہ اپنی طاقت کے بل پر یہاں من مانی کرسکتا ہے اور اُسے روکا نہیں جاسکتا؟

ملک کے سیاسی نظام کی بنیاد سیکولرزم اور جمہوریت پر رکھی گئی ہے۔ کیا یہ بنیاد اب کم زور ہوتی جا رہی ہے اور اس کے منہدم ہونے کا خطرہ لاحق ہے؟ یہاں کی اخلاقی اقدار میں بقاء باہم اور رواداری بہت نمایاں سمجھی جاتی تھی، کیا اب یہ قدریں باقی نہیں رہیں اور ماضی کی داستان بن گئی ہیں۔ ملک کی بقا و سالمیت، اتحاد اور یک جہتی کا جو نقشہ یہاں کے قومی راہ نماؤں نے اپنے سامنے رکھا تھا کیا اب وہ بدل رہا ہے اور ایک نیا نقشہ ابھر رہا ہے؟ جس ملک کو مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، کیا اب وہ ایک ساتھ یہاں رہ سکیں گے اور انھیں فطری انداز میں پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل رہیں گے یا یہاں صرف ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک خاص ذہن وفکر کو باقی رہنے کا حق ملے گا؟

ان ہنگاموں میں سب سے زیادہ مسلمان متاثر ہوئے۔ وہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے باوجود سوچنے پر مجبور ہیں کہ بابری مسجد کا شہید ہونا ایک اتفاقی واقعہ یا جذباتی اور وقتی حادثہ ہے یا اس کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ اور گہری سازش ہے؟ عبادت گاہ تو دنیا کی سب سے محفوظ جگہ سمجھی جاتی ہے، اس کا احترام ہر شخص کرتا ہے، چاہے وہ کسی بھی فرقہ یا گروہ کی عبادت گاہ ہو، جب وہ محفوظ نہیں رہی تو پھر کون سی چیز محفوظ رہ سکتی ہے؟ کیا ان کی جان، مال، عزت و آبرو اور مذہب و تہذیب کسی بڑے خطرہ سے دوچار ہے؟ ملک میں ان کی باعزت زندگی گزارنے کا کیا راستہ ہے؟ کیا اب مایوسی اور اندھیرا ہی ہے یا امید کی کوئی کرن بھی ہے؟

حالات ہزار خراب سہی لیکن مایوسی اور ناامیدی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ قوموں پر نازک سے نازک وقت آتا ہے اور کبھی بدترین حالات سے انھیں گزرنا پڑتا ہے۔ اسی میں ان کا امتحان ہوتا ہے۔ جو قوم حالات کو ناسازگار اور ماحول کو ناموافق دیکھ کر نہ گھبرائے، مایوس نہ ہو، ہمت نہ ہارے، ہوش و حواس باقی رکھے، حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور استقامت اور پامردی کا ثبوت فراہم کرے وہ کامیاب و کامران ہوکر ابھرتی ہے اور اپنا مقام آپ پیدا کرلیتی ہے۔ اس کے برخلاف حالات کی سنگینی جس قوم

کو مضمحل اور ناتواں کردے اور جو ہر چھوٹی بڑی آزمائش کو اپنے لیے موت کا پیغام سمجھ بیٹھے اسے دنیا کی کوئی طاقت زندگی اور توانائی فراہم نہیں کرسکتی۔ وہ خود بخود ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو قوم اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین رکھتی ہو وہ کبھی مایوسی اور ناامیدی کا شکار نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ سب سے بڑی قوت اسی کی ہے، اس سے بڑی کوئی قوت نہیں ہے۔ ساری قوتوں کا سرچشمہ اس کی ذات ہے۔ وہ جب چاہے ظلمتِ شب کو نورِ سحر میں تبدیل کرسکتا ہے اور موت کے سایوں میں زندگی کے آثار پیدا کرنا اس کے لیے ناممکن نہیں ہے۔ حالات اگر تاریک ہیں تو اس کے حکم سے روشن اور تاب ناک بھی ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ کرشمے اس وقت ظاہر ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے ظاہر ہوتے ہیں جو ایمان وعمل کی دولت سے مالا مال ہوں، جو صرف ایک اللہ کی ذات پر بھروسا رکھتے ہوں، جو ہر حال میں اس کے دامن سے چمٹے رہیں، جو اس کے سوا کسی اور سے کوئی توقع نہ رکھیں اور اسی کو اپنا آخری ملجا و ماویٰ تصور کریں۔

حالات سے گھبرا کر بعض لوگ ان کے فوری حل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ بلاشبہ ان کا فوری حل ڈھونڈنا بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ کوئی مستقل اور پائیدار حل نہ ہوگا۔ موجودہ حالات کے وقوع میں ہماری طویل غفلت اور کوتاہی کا بڑا دخل ہے۔ ان میں تبدیلی لانے کے لیے بھی طویل جدوجہد کرنی ہوگی۔ کوئی مختصر راستہ اس طویل جدوجہد کا بدل نہیں ہے۔

۱-سب سے پہلے باشندگانِ ملک کے سامنے ہمارے صحیح تعارف کی ضرورت ہے۔ ہمارا تعارف ایک ایسی قوم کی حیثیت سے نہ ہو جس کا کوئی متعین نصب العین نہیں ہے، کوئی خاص طریقۂ حیات اور خاص تہذیب و معاشرت نہیں ہے، بلکہ بعض تاریخی عوامل اور کچھ رسوم و روایات نے اسے ایک قوم بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس اس کا تعارف ایک ایسی امت کی حیثیت سے ہو جو متعین اصول و نظریات کی مالک ہے۔ جنھیں وہ حق و صداقت پر مبنی اور اپنے لیے اور ساری دنیا کے لیے فلاح و نجات کا ذریعہ

تصور کرتی ہے، وہ مخصوص طرزِ فکر اور تصورِ حیات رکھتی ہے جو اسے جان، مال اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے، جس سے وہ کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہوسکتی، وہ ایک ایسی امت ہے جو اخلاقی اقدار کی حامل ہے جو اس کے نزدیک قابل احترام ہیں۔ اس کی تہذیب، معاشرت، سیاست ہر چیز کے پیچھے ارفع و اعلیٰ اور بہت ہی پاکیزہ تصورات کارفرما ہیں۔

اس تعارف پر اگر طنز وتعریض کی جاتی ہے، قدامت پرستی اور دقیانوسیت کا طعنہ دیا جاتا ہے، عہدِ جدید کے تقاضوں سے بے خبری کا الزام عائد ہوتا ہے تو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا جائے، اس پر مطمئن کرنے کی جو بھی معقول کوشش ہوسکتی ہے کی جائے، اور جو اعتراضات ہوں انھیں حکمت و دانائی سے رفع کرنے کی اور جو شبہات ہوں ان کے ازالہ کی تدبیر کی جائے۔

۲- جن اعلیٰ اصول اور اقدارِ حیات پر ایمان کا ہم دعویٰ کرتے ہیں انھیں ہماری زندگیوں میں جلوہ گر ہونا چاہیے۔ ہماری سیرت ان کی ترجمان ہو، ہمارے اعمال ان کی گواہی دیں، ہمارے اخلاق سے ان کا ثبوت ملے، ہمارے معاملات ان کی تصدیق کریں اور ہمارے تعلقات سے ان کی ضوفشانی ہوتی رہے۔ ہم میں سے جو جس خاندان کا فرد ہو اس کے حقوق پہچانے، کسی کا پڑوسی ہو تو بہتر پڑوسی ہو، تاجر ہو تو امانت دار تاجر ہو، ملازم ہو تو فرض شناس ملازم ہو، مالک ہو تو ماتحتوں کے حقوق بہ خوشی ادا کرے، اس کی ذات سے نہ کسی کو اندیشہ ہو اور نہ کوئی خطرہ محسوس کرے، وہ ہر ایک کے دکھ درد میں کام آئے اور ان کے رنج و راحت میں شریک رہے۔ دنیا کو یہ ثبوت ملے اور مسلسل ملتا چلا جائے کہ مسلمان خوشی اور غم، دشواری اور آسانی کسی حال میں اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی نہیں کرتا، ماحول پر امن ہو یا چاروں طرف فتنہ وفساد کے شعلے بھڑک رہے ہوں وہ اسلام کے قائم کردہ حدود کو پامال نہیں کرسکتا، فسادات میں جب معصوم اور بے گناہ مارے جاتے ہیں، عصمتیں لٹتی ہیں، املاک اور جائداد نذرِ آتش ہوتی ہے اس وقت بھی وہ

دوسروں کی جان، مال اور عزت و آبرو کا محافظ بن کر سامنے آتا ہے۔ اس طرح وہ جہاں رہے اور جس حال میں رہے اسلام کی تعلیم کا پابند رہے اور اس کے ذریعے دنیا کو اسلام کا درس ملتا رہے۔

۳- اس امت کو خیر امت کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ساری دنیا کے لیے اپنے پاس خیر و فلاح کا پیغام رکھتی ہے۔ اس پیغام کو عام ہونا چاہیے۔ اس ملک کے سامنے یہ بات آنی چاہیے اور پورے زور اور قوت کے ساتھ آنی چاہیے کہ مسلمان اس ملک کے خیر خواہ ہیں اور خداپرستی کی بنیاد پر اس کی تعمیر و ترقی چاہتے ہیں۔ مختلف طبقات اور گروہوں کے درمیان تصادم کو وہ غلط اور ناروا تصور کرتے ہیں اور ان کے درمیان اتحاد اور یگانگت کا جذبہ بیدار کرتے ہیں، وہ کسی کے حلیف یا حریف نہیں ہیں، بلکہ سب انسانوں کو ایک خدا کی مخلوق جانتے ہیں اور ان کی بھلائی کا پروگرام رکھتے ہیں۔ وہ اس ملک کے سامنے ظلم و زیادتی کو ختم کرنے والے اور عدل و انصاف کے علم بردار کی حیثیت سے آئیں، یہاں کی طبقاتی اور گروہی کشمکش کو ختم کریں، کم زور طبقات کو طاقت ور طبقات کے جور و ستم سے بچائیں اور وحدتِ انسانیت کا درس دیں۔

۴- قرآن مجید نے اختلاف و انتشار سے منع کیا اور کہا کہ اس سے تم کم زور ہوجاؤ گے اور تمھارے قدم اکھڑ جائیں گے۔ آج اسی صورتِ حال سے ہم دو چار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو بعض، بنیادی تصورات کے تحت متحد و منظّم کیا تھا اور وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر ابھری تھی، مخالف طاقتیں اس سے ٹکراتیں لیکن اس میں کوئی رخنہ نہیں ڈال پاتی تھیں۔ آج یہ تصورات ہی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے ہیں، چھوٹے چھوٹے مسائل نے ہماری صفوں میں بڑے بڑے شگاف ڈال دیے ہیں اور ہم ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ بعض مسائل میں اختلاف فطری ہے، وہ اختلاف موجود ہے اور رہے گا۔ ان میں زیادہ تر مسائل کی نوعیت جزئی اور فروعی ہے، لیکن مختلف اسباب کی بنا پر یہی ہمارے انتشار کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ اس صورت حال کو

ختم ہونا چاہیے۔ اس حقیقت کو ہم فراموش نہیں کر سکتے کہ اس امت کا نفع و ضرر اور سود و زیاں ایک ہے۔ اس پر اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو کسی کا مسلک معلوم کر کے نہیں آتی، بلکہ امت کے فرد کی حیثیت سے آتی ہے۔ یہ امت اگر ابھرے گی تو امت مسلمہ ہی کی حیثیت سے ابھرے گی۔ اس ملک میں ہمارے موجودہ پریشان کن مسائل کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تقریباً پندرہ کروڑ کی تعداد میں ہونے کے باوجود ہماری کوئی ایک آواز نہیں ہے۔ ہماری ایک آواز ہوتی تو شاید ہمارے مسائل اتنے پیچیدہ نہ ہوتے۔

۵- اس وقت سب سے اہم اور فوری مسئلہ یہ ہے کہ ملک کے مختلف طبقات کے درمیان نفرت، تعصب اور تنگ نظری کی جو فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کا بھرپور مقابلہ کیا جائے، امن و امان بحال ہو، قانون کی حکم رانی ہو، عدل و انصاف ہو، ہر شخص کو برابر کے حقوق حاصل ہوں، ترقی کی راہیں سب کے لیے کھلی رہیں اور ہر ایک کو اپنی صلاحیت کے مطابق ملک و قوم کی خدمت کے مواقع حاصل ہوں، جو اختلافات ہوں انھیں سنجیدہ اور پرسکون ماحول میں حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کسی ایک فرد یا گروہ کی نہیں بلکہ پورے ملک کی ضرورت ہے۔ یہ اس ملک کی اندرونی آواز ہے جسے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس وسیع و عریض ملک میں ایک چھوٹا سا طبقہ ہے جو یہاں کی فضا کو مکدر کرنا چاہتا ہے اور کر رہا ہے۔ ہنگاموں کو ہوا دیتا اور اس میں شریک ہوتا ہے۔ اس طبقہ کا کوئی دین دھرم یا کوئی اخلاق نہیں ہے۔ اس کے پیچھے جو ناپاک مقاصد ہیں ان سے دنیا واقف ہے۔ اس ذہن کے افراد ہر جگہ اور ہر قوم میں مل جائیں گے، لیکن اس ملک کی بہت بڑی آبادی امن و امان اور سکون چاہتی ہے۔ اس کے پاس ان ہنگاموں کے لیے فرصت ہے اور نہ یہ اس کا مزاج ہے۔ اس کی کم زوری یہ ہے کہ ان نازک حالات میں خاموشی ہی میں اپنی عافیت سمجھتی ہے۔ اس کے اندر حق کو حق اور ناحق کو ناحق کہنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہمارے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ ایسے افراد کی پہلے بھی کمی نہیں تھی اور موجودہ ہنگاموں کے بعد تو

ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوا ہے، جنھوں نے حالیہ فسادات اور ہنگاموں پر اپنی ناگواری اورناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، جو لوگ ان میں پیش پیش رہے ہیں ان کے ناپاک عزائم کو واضح کیا ہے اور ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ انھیں اس بات پر افسوس اور صدمہ ہے کہ ان ہنگاموں سے ہمارے ملک کی تصویر بگڑی ہے اور ہم سب کی بدنامی اور رسوائی ہوئی ہے۔ ان میں سیاسی افراد بھی ہیں، دانش ور اور مفکر بھی ہیں، سماجی کارکن بھی ہیں اور صحافت سے تعلق رکھنے والے تو اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ سیاسی جماعتوں نے بھی اس پر اپنے رنج و ملال کا اظہار کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس احساس کو تقویت پہنچائی جائے اور ان کے ساتھ مل کر امن و امان اور عدل و انصاف کی فضا بحال کی جائے اور یہ حقیقت پوری قوت کے ساتھ واضح کی جائے کہ اس ملک کی سالمیت، اتحاد اور ترقی کے لیے امن و امان کا قائم رہنا ضروری ہے، اس کے لیے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ اور لائحۂ عمل تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

(سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' علی گڑھ، جنوری- مارچ ۱۹۹۳ء)

---